ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی کا ترجمان



سہ ماہی

تحقیقات اسلامی

علی گڑھ

انابت الی اللہ
سید جلال الدین عمری
علامہ بقاعیؒ کی تفسیر نظم الدرر میں ربط آیات کا مطالعہ
ڈاکٹر عبید اللہ فہد فلاحی
تدوین حدیث اور سیرت نگاری میں نقد و تحقیق
جناب محمد طیب
نظام خاندان - مشترکہ یا جداگانہ؟
مولانا ولی اللہ مجید قاسمی
مولانا مودودیؒ - ایک صاحب طرز اسلوب نگار
ڈاکٹر محمد جاوید اصغر -
علامہ مجد الدین فیروز آبادیؒ - بہ حیثیت مفسر
ڈاکٹر محمد احمد الکردی / مولانا محمد جرجیس کریمی
تعارف وتبصرہ
محمد رضی الاسلام ندوی
ڈاکٹر تابش مہدی

ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی، علی گڑھ

ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی کا ترجمان

سہ ماہی

تحقیقاتِ اسلامی

علی گڑھ

جنوری ——— مارچ ۲۰۱۲ء

مدیر

سیّد جلال الدین عمری

معاون مدیر

محمد رضی الاسلام ندوی

نبی نگر (جمال پور)، پوسٹ بکس نمبر ۹۳، علی گڑھ-۲۰۲۰۰۲

Nabi Nagar (Jamalpur) P.O.Box: 93, ALIGARH-202002 (INDIA)

سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی علی گڑھ

جلد:۳۱ شمارہ:۱

صفر ——— ربیع الثانی ۱۴۳۳ھ

جنوری ——— مارچ ۲۰۱۲ء

تحقیقاتِ اسلامی کے تمام شمارے www.tahqeeqat.net پر ملاحظہ کریں

ادارتی امور

موبائل : 09582050234

ای میل : tahqeeqat@gmail.com

mrnadvi@yahoo.com

انتظامی امور

فون : 0571-2902034

موبائل: 09897655171

ای میل: tahqeeqateislami@gmail.com

tahqeeqat_islami@yahoo.com

زرِ تعاون

اندرونِ ملک

فی شمارہ	۳۰ روپے
سالانہ	۱۲۰ روپے
پانچ سال کے لیے	۵۰۰ روپے
سالانہ (لائبریریاں وادارے)	۱۵۰ روپے

برائے پاکستان

سالانہ (انفرادی)	۲۰ ڈالر امریکی
سالانہ (ادارے)	۲۵ ڈالر امریکی

برائے دیگر ممالک

سالانہ (انفرادی)	۲۵ ڈالر امریکی
سالانہ (ادارے)	۳۰ ڈالر امریکی

طابع وناشر سید جلال الدین عمری نے بھارت آفسیٹ دہلی-۶ سے چھپوا کر
ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی، نبی نگر (جمال پور) علی گڑھ سے شائع کیا

فہرست مضامین

حرف آغاز

انا بت الی اللہ — سید جلال الدین عمری — ۵

تحقیق وتنقید

علامہ برہان الدین بقاعی کی تفسیر
نظم الدرر میں ربط آیات کا مطالعہ — ڈاکٹر عبید اللہ فہد فلاحی — ۱۵

تدوین حدیث اور سیرت نگاری میں
نقد وتحقیق - آغاز وارتقاء — جناب محمد طیب — ۳۷

بحث ونظر

نظام خاندان - مشترکہ یا جداگانہ؟ — مولانا ولی اللہ مجید قاسمی — ۵۳

سیر وسوانح

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی -
ایک صاحب طرز اسلوب نگار — ڈاکٹر محمد جاوید اصغر — ۶۹

ترجمہ وتلخیص

علامہ مجدالدین فیروزآبادی - بہ حیثیت مفسر — ڈاکٹر محمد احمد الکردی
مترجم: مولانا محمد جرجیس کریمی — ۸۹

تعارف وتبصرہ

عصر حاضر کا سماجی انتشار اور اسلام کی رہ نمائی — محمد رضی الاسلام ندوی — ۱۱۳
حضرت خضر تحقیق کی روشنی میں — ،، ،، — ۱۱۴
معاشی مسائل اور قرآنی تعلیمات — ،، ،، — ۱۱۵
تاریخ تدوین وجمع قرآن — ڈاکٹر تابش مہدی — ۱۱۶

خبرنامہ ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی (۴۲) — ۱۱۹

اس شمارے کے لکھنے والے

۱۔ ڈاکٹر عبیداللہ فہد فلاحی
ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

۲۔ جناب محمد طیب
لیکچرر شعبہ علوم اسلامیہ، جی سی یونی ورسٹی، فیصل آباد (پاکستان)

۳۔ مولانا ولی اللہ مجید قاسمی
استاذ حدیث، جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڑھ

۴۔ ڈاکٹر محمد جاوید اصغر
لیکچرر شعبۂ اردو، گورنمنٹ کالج جہانیان (پاکستان)

۵۔ ڈاکٹر محمد احمد الکردی
جامعہ زیتونیہ، تیونس

۶۔ مولانا محمد جرجیس کریمی
رکن ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی، علی گڑھ

۷۔ محمد رضی الاسلام ندوی
معاون مدیر سہ ماہی تحقیقات اسلامی، علی گڑھ

۸۔ ڈاکٹر تابش مہدی
مدیر معاون ماہ نامہ زندگی نو، نئی دہلی

۹۔ سید جلال الدین عمری
صدر ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی، علی گڑھ

انابت الی اللہ

——————— سید جلال الدین عمری

انابت کا معنی ومفہوم

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں ایمان، عبادت، اطاعت، تقویٰ اور اخلاص جیسے اعلیٰ اوصاف دیکھنا چاہتا ہے۔ ان ہی میں ایک وصف 'انابت' بھی ہے۔ انابت کے معنی ہیں: بار بار پلٹنا۔ اس میں ملاقات کے لیے وقتاً فوقتاً حاضر ہونے کا بھی تصور ہے[۱]

انابت الی اللہ کے معنی ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف پورے اخلاص کے ساتھ پلٹنا اور رجوع کرنا۔ علامہ قرطبی کہتے ہیں:

لِانابة الرجوع الَی اللّٰہ بالاِخلاص[۲] — اللہ کی طرف اخلاص کے ساتھ رجوع کرنا انابت ہے۔

قرآن مجید کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ انابت الی اللہ عبادت میں، اخلاق میں، معاملات میں، دعوت اور اقامت دین کی سعی و جہد میں، مخالفتوں کے جواب میں، تکلیف و پریشانی میں، گناہوں سے مغفرت کی طلب میں، زندگی کے ہر قدم پر اور ہر معاملے میں مطلوب ہے:

انابت دین فطرت کا تقاضا

سورۂ روم میں شرک کی تردید اور اس کی نامعقولیت کے بیان کے بعد توحید کی

---

[۱] انابت کا مادہ نوب ہے۔ امام راغب فرماتے ہیں: النوب رجوع الشیء مرة بعد اخری ... و فلان ینتاب فلانا ای یقصدہ مرة بعد اخری۔ مفردات القرآن، مادہ نوب، ص: ۵۰۹

[۲] قرطبی، الجامع لاحکام القرآن، ج۸، جز ء۱۵، ص ۵۷۱۔ امام راغب کہتے ہیں: والانابة الی اللہ تعالیٰ الرجوع الیہ بالتوبة و اخلاص العمل، مفرات القرآن، ص: ۵۰۹

دعوت ہے۔ کہا گیا کہ توحید دینِ فطرت ہے، اسے یکسوئی کے ساتھ اختیار کیا جائے:

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفاً فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِىْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ○ (الروم:۳۰)

اپنا رخ ہر طرف سے یکسو ہوکر اللہ کے دین کی طرف پھیر لو۔ یہ اللہ کی پیدا کردہ فطرت ہے، جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی تخلیق میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔ یہ دینِ قیم (سیدھا) ہے، لیکن اکثر لوگ اسے نہیں جانتے۔

اس کے بعد دینِ فطرت پر یکسوئی کے ساتھ قائم رہنے کے لیے کہا گیا:

مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ وَ اتَّقُوْهُ وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ لَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ○ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِيَعاً كُلُّ حِزْبٍ م بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ○ (الروم:۳۱،۳۲)

(دینِ فطرت پر عمل کرو) اللہ کی طرف رجوع کرتے ہوئے، اس کا تقویٰ اختیار کرو، نماز قائم کرو اور مشرکوں میں سے نہ ہوجاؤ، جنھوں نے اپنے دین کو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا اور گروہوں میں بٹ گئے۔ ان میں سے ہر فرقہ کے پاس جو کچھ ہے اسی میں وہ مگن ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ دینِ فطرت پر قائم رہنے کے لیے ضروری ہے کہ انابت، تقویٰ اور اقامتِ صلوٰۃ پر عمل ہو اور کسی بھی عمل میں مشرکوں کا سا رویہ نہ اختیار کیا جائے۔ مشرکوں کے بارے میں کہا گیا کہ توحید کو چھوڑنے کے نتیجہ میں وہ مختلف فرقوں میں بٹ گئے ہیں اور ہر فرقہ اپنے خیال میں مست ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ دینِ فطرت انابت اور تقویٰ کا طالب ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ نماز اور عبادت، اللہ ہی کے لیے ہو اور یہی اہل ایمان کے درمیان اتحاد و اتفاق کی بنیاد بنے۔ اختلاف اور گروہ بندی مشرکانہ روش ہے، اس سے اجتناب ہونا چاہیے۔

طاغوت سے اجتناب اور انابت

کفر بالطاغوت اور ایمان باللہ دین کی اساس ہے۔ جو شخص اس احساس پر قائم ہے، اس کے ہاتھ میں ایک ایسی مضبوط رسی ہے، جو ٹوٹتی نہیں ہے۔ وہ اسے لازماً اللہ تک

پہنچائے گی:

فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ يُؤْمِنْ ۢبِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ○ (البقرۃ:۲۵۶)

پس جو طاغوت کا انکار کرے اور اللہ پر ایمان لائے، اس نے ایک مضبوط سہارا تھام لیا، جو ٹوٹنے والا نہیں ہے۔ اور اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

طاغوت سے اجتناب کے ساتھ انابت الی اللہ اور قرآن مجید کی اتباع ضروری ہے۔ اس راہ کے اختیار کرنے والے کے لیے دنیا میں اجر و ثواب کی اور آخرت میں جنت کی بشارت ہے۔[1]

وَ الَّذِيْنَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوْتَ اَنْ يَّعْبُدُوْهَا وَ اَنَابُوْا اِلَى اللّٰهِ لَهُمُ الْبُشْرٰى فَبَشِّرْ عِبَادِ ○ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدٰىهُمُ اللّٰهُ وَ اُولٰٓئِكَ هُمْ اُولُوا الْاَلْبَابِ ○ (الزمر:۱۷،۱۸)

وہ لوگ جنھوں نے طاغوت کی عبادت سے اجتناب کیا اور اللہ کی طرف رجوع کیا ان کے لیے بشارت ہے۔ لہٰذا میرے بندوں کو بشارت دے دو، جو ہر بات کو غور سے سنتے ہیں اور اس میں جو احسن ہے اس کی اتباع کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں، جن کو اللہ نے ہدایت دی ہے اور یہی عقل والے ہیں۔

انابت سے ہدایت ملتی ہے

اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ○ (الشوریٰ:۱۳)

اللہ تعالیٰ منتخب کر لیتا ہے اپنے لیے جس کو چاہتا ہے اور ہدایت دیتا ہے اس شخص کو جو اس کی طرف رجوع کرتا ہے۔

یہاں نبوت و رسالت اور اللہ کے قانونِ ہدایت کا ذکر ہے۔ نبوت و رسالت کے متعلق فرمایا کہ یہ کسبی چیز نہیں ہے کہ آدمی محنت سے اسے حاصل کر لے، بلکہ یہ منصب خالصتاً وہبی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے لیے جس کا چاہے انتخاب کرتا ہے۔ جہاں تک ہدایت کا تعلق ہے اس سلسلہ میں اللہ کا ضابطہ یہ ہے کہ جو کوئی اس کی طرف رجوع کرتا ہے اسے وہ ہدایت سے نوازتا ہے۔

---

[1] ذیل کی آیت کے سلسلے میں ملاحظہ ہو زمخشری، الکشاف عن حقائق التنزیل: ۴/۱۱۶

آیاتِ کائنات سے راہ نمائی کے لیے انابت چاہیے

ایک جگہ ارشاد ہے: کائنات میں پھیلی ہوئی اللہ کی نشانیوں پر وہی شخص غور کرتا اور فائدہ اٹھاتا ہے، جس کے اندر 'انابت' کا جذبہ پایا جائے:

هُوَ الَّذِیْ یُرِیْكُمْ اٰیٰتِهٖ وَ یُنَزِّلُ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ رِزْقًا وَّ مَا یَتَذَكَّرُ اِلَّا مَنْ یُّنِیْبُ ○ (المومن:۱۳)

وہی ہے جو تم کو اپنی نشانیاں دکھاتا ہے اور تمھارے لیے آسمان سے رزق نازل کرتا ہے۔ اس سے وہی نصیحت حاصل کرتا ہے، جسے اللہ کی طرف رجوع حاصل ہو۔

یہی بات سورہ 'قٓ' میں کسی قدر تفصیل سے بیان ہوئی ہے:

اَفَلَمْ یَنْظُرُوْٓا اِلَى السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ كَیْفَ بَنَیْنٰهَا وَ زَیَّنّٰهَا وَ مَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ ○ وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَ اَلْقَیْنَا فِیْهَا رَوَاسِیَ وَ اَنْۢبَتْنَا فِیْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍۭ بَهِیْجٍ ○ تَبْصِرَةً وَّ ذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِیْبٍ ○ (قٓ:۶-۸)

کیا انہوں نے اپنے اوپر آسمان کو نہیں دیکھا کہ کس طرح ہم نے اسے بنایا اور اسے رونق عطا کی ہے۔ اس میں کوئی شگاف نہیں ہے۔ ہم نے اس میں پہاڑ جما دیے ہیں اور ہر طرح کی بارونق نباتات اگادی ہے۔ اس میں ہر اس بندے کے لیے بصیرت اور نصیحت ہے جو اللہ کی طرف رجوع کرے۔

رسول ﷺ سے مشرکین کسی محسوس اور مادی معجزے کا مطالبہ کرتے تھے۔ اس کے جواب میں کہا گیا کہ یہ قرآن خود معجزہ ہے۔ اس کا انکار کر کے کچھ لوگ گمراہ ہو رہے ہیں اور جن کو اللہ کی طرف رجوع نصیب ہے وہ اس سے ہدایت پا رہے ہیں:

وَ یَقُوْلُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَوْلَاۤ اُنْزِلَ عَلَیْهِ اٰیَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ یُضِلُّ مَنْ یَّشَآءُ وَ یَهْدِیْۤ اِلَیْهِ مَنْ اَنَابَ ○ (الرعد:۲۷)

جن لوگوں نے کفر کیا وہ کہتے ہیں کہ اس شخص (ﷺ) پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں نازل کی گئی؟ ان سے کہہ دو اللہ (اس طرح) جسے چاہتا ہے گم راہ کرتا ہے اور جو اس کی طرف رجوع کرے اسے ہدایت سے نوازتا ہے۔

انابت اور توبہ

انابت الی اللہ دراصل توبہ ہے۔ توبہ کے معنی گناہوں سے کنارہ کشی اور اللہ کی طرف رجوع کے ہیں۔ جب بندہ اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے تو اللہ کی نظر عنایت بھی اس کی طرف ہوتی ہے:[۱]

قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰی اَنْفُسِھِمْ لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَّحْمَۃِ اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعاً اِنَّہٗ ھُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ○ وَ اَنِیْبُوْٓا اِلٰی رَبِّکُمْ وَ اَسْلِمُوا لَہٗ مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَکُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ○ وَ اتَّبِعُوْٓا اَحْسَنَ مَا اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَکُمُ الْعَذَابُ بَغْتَۃً وَّاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ○ (الزمر:۵۳-۵۵)

کہہ دو اے میرے بندو جنھوں نے اپنے اوپر زیادتی کی ہے کہ تم اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ۔ بے شک اللہ تمام گناہوں کو معاف کردے گا۔ یقیناً وہ غفور ورحیم ہے۔ اپنے رب کی طرف انابت اختیار کرو اور اس کے سامنے جھک جاؤ، قبل اس کے کہ تم پر عذاب آ جائے اور پھر کہیں سے تمھاری مدد نہ ہو، اور اتباع کرو اس بہتر ہدایت کی جو تمھارے رب کی طرف سے تمھارے لیے نازل کی گئی ہے اس سے پہلے کہ اچانک تم پر عذاب آ جائے اور تمھیں اس کا شعور بھی نہ ہو پائے۔

ان آیات میں بڑے سے بڑے گناہ گار اور معصیت کیش کے لیے بھی اعلان ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کا گناہ معاف کردے گا۔ اسی کے ساتھ یہ بھی کہا گیا کہ انسان انابت اور اسلام کی راہ اختیار کرے۔ یہ درحقیقت ایک شرط ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کے اعلان مغفرت سے مطمئن ہوکر اور زیادہ دیدہ دلیری کے ساتھ معصیت کی راہ پر گام زن نہ ہو، بلکہ غلط روش سے

---

[۱] صاحب القاموس کہتے ہیں: تاب الی اللہ کے معنی ہیں 'رجع عن المعاصی' اس نے معصیت سے رجوع کیا۔ اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف بھی ہوتی ہے۔ اس کے معنی توفیق و ہدایت، آسانی فراہم کرنا اور اللہ کے فضل وکرم کے ہیں۔ اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کو توّاب کہا جاتا ہے۔ تاب اللہ علیہ وفقہ للتوبۃ او رجع بہ من التشدید الی التخفیف او رجع علیہ لفضلہٖ و قبولہ و ھو توّاب علی عبادہ۔ القاموس المحیط، مادہ تاب، ص:۹۰

توبہ کرے، اس کی طرف پلٹے اور اس کے احکام و ہدایات کی پابندی اختیار کرے۔ زمخشری نے اسے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

انما ذکر الاِنابة علی اثر المغفرة لئلا یطمع طامع فی حصولها بغیر توبة، وللدلالة علی انها شرط فیها لازم لا تحصل بدونه[1]

مغفرت کے بعد انابت کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے، تاکہ کوئی جھوٹی طمع کرنے والا توبہ کے بغیر ہی اس کی طمع نہ کرنے لگے۔ یہ اس بات پر بھی دلالت کرتا ہے کہ توبہ اور انابت، شرط لازم ہے مغفرت کے لیے۔ اس کے بغیر وہ حاصل نہیں ہوسکتی۔

انابت، اسلام اور اتباع یہ ایک ہی حقیقت کے مختلف پہلو ہیں۔ اگر فرق کیا جاسکے تو کہا جائے گا کہ انابت سے قلبی کیفیت اور اسلام سے اس کا عملی اظہار مراد ہے اور اتباعِ احکامِ خداوندی اس کی تفصیل ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو دنیا اور آخرت میں اللہ کی پکڑ بھی ہوسکتی ہے۔

حضرت داؤد علیہ السلام کی قرآن نے تعریف کی ہے:

اُذْکُرْ عَبْدَنَا دَاوٗدَ ذَا الْاَیْدِ اِنَّهٗ اَوَّابٌ ○ (ص: ۱۷)

ہمارے بندے داؤد کا ذکر کرو۔ وہ بڑے اقتدار والے اور اللہ کی طرف بہت زیادہ رجوع ہونے والے تھے۔

مطلب یہ کہ حکومت اور غیر معمولی اختیارات کے باوجود وہ اللہ کی طرف بہت زیادہ رجوع کرتے تھے۔ ان سے ایک معاملے میں بھول ہوگئی۔ لیکن جب تنبہ ہوا تو اللہ کے سامنے جھک گئے اور انابت اختیار کی۔ اللہ نے انھیں معاف کیا اور ان کے درجات بلند کیے:

فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ وَخَرَّ رَاکِعاً وَ اَنَابَ ○ فَغَفَرْنَا لَهٗ ذٰلِکَ وَ اِنَّ لَهٗ عِندَنَا لَزُلْفٰی وَحُسْنَ مَآبٍ ○ (ص: ۲۴-۲۵)

پھر انھوں نے اپنے رب سے مغفرت چاہی اور گر پڑے جھک کر۔ پس ہم نے ان کو اس معاملہ میں معاف کر دیا۔ بے شک انھیں ہمارے پاس قربت اور اچھا ٹھکانا ہے۔

انابت الی اللہ رسولوں کا ایک وصفِ خاص

اللہ تعالیٰ کے رسولوں کا ایک نمایاں وصف ان کی انابت ہے۔ وہ جس طرح اللہ

[1] زمخشری، الکشاف: ۱۳۱/۴

تعالیٰ کی طرف بار بار رجوع کرتے ہیں، اس کا قرآن مجید میں ذکر ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ایمان اور اسلام، ان کا اللہ کے ہر حکم پر سر تسلیم خم کرنا، اس کی راہ میں تکلیفیں برداشت کرنا، بڑی سے بڑی قربانی پیش کرنے میں ذرہ برابر پس وپیش نہ کرنا ان کی زندگی کے نمایاں پہلو ہیں۔ ان کی انابت اور رجوع الی اللہ کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے:

اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ ○ (ہود:۷۵) بے شک ابراہیم، بڑے حلیم، نرم دل اور اللہ کی طرف متوجہ رہنے والے تھے۔

یہاں حضرت ابراہیم کی تین صفات بیان ہوئی ہیں: ایک یہ کہ وہ حلیم تھے۔ یعنی بردبار تھے، جلد باز نہ تھے۔ ان کے مخالفین نے ان کے ساتھ بدترین رویہ اختیار کیا۔ وہ اس پر مشتعل نہ ہوئے، ان کا جواب نہ دیا اور صبر کیا۔ ان کی دوسری خوبی یہ ہے کہ وہ 'اوّاہ' تھے۔ اس کا مطلب ہے وہ اللہ کے خوف اور خشیت سے بہت زیادہ آہ وزاری کرتے تھے۔ ہر وقت ان پر اس کی ہیبت طاری رہتی تھی۔ ان کی تیسری خوبی یہ کہ ان کے اندر انابت تھی، وہ اللہ کی رضا کے طالب تھے، ہمیشہ اس کی طرف متوجہ ہوتے اور اس کے ہر حکم کی تعمیل میں سرگرم رہتے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام ایسی سلطنت کے مالک تھے جیسی کسی کو نہیں عطا ہوئی تھی۔ ان کے متعلق ارشاد ہے۔

نِعْمَ الْعَبْدُ اِنَّهٗ اَوَّابٌ ○ (ص:۳۰) وہ اللہ کے اچھے بندے تھے اور اس کی طرف کثرت سے رجوع کرتے تھے۔

حضرت شعیب علیہ السلام کی بعثت مدین کی طرف ہوئی تھی۔ انہوں نے اپنی قوم کو اللہ واحد کی عبادت اور اس کی ہدایت کے تحت زندگی گزارنے، خاص طور پر معاملات کی درستگی کی دعوت دی۔ جب ان کی دعوت کی شدید مخالفت ہونے لگی تو وہ قوم سے کہتے ہیں:

وَ مَا اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَا اَنْهٰكُمْ عَنْهُ اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ وَ مَا تَوْفِيْقِيْ اِلَّا بِاللّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَ اِلَيْهِ اُنِيْبُ ○ (ہود:۸۸) میں نہیں چاہتا کہ پلٹ کر وہی کام کروں، جس سے میں تمھیں منع کر رہا ہوں۔ میں جہاں تک ہو سکے صرف اصلاح چاہتا ہوں۔ یہ سب کچھ اللہ کی توفیق ہی سے میرے لیے ممکن ہے۔ اس پر میرا توکل اور اعتماد ہے اور اسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں۔

مطلب یہ کہ جن امور سے باز رہنے کی میں تمھیں نصیحت کر رہا ہوں، بعد میں ان کا ارتکاب کر کے میں اپنی دنیا نہیں بنا رہا ہوں۔ میں تو حسب استطاعت اصلاحِ حال کی کوشش کر رہا ہوں۔ یہ سب کچھ اللہ کی توفیق ہی سے ہوسکتا ہے۔ اس لیے اس پر میرا بھروسہ ہے اور اپنے تمام معاملات میں اس کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

رسول اللہ ﷺ اپنے مخاطبین سے فرماتے ہیں: اختلافات میں فیصلہ کا حق اللہ کو حاصل ہے۔ کسی بھی معاملہ میں اس کا فیصلہ آخری فیصلہ ہے۔ دنیا اور آخرت میں وہی فیصلہ کرے گا۔ تم جن امور میں مجھ سے اختلاف کرتے ہو، دیکھو کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کے ذریعے کیا ہدایت دی ہے اور کیا دلائل فراہم کیے ہیں۔ تمھاری مخالفت جاری ہے تو اس کے مقابلہ میں مجھے اللہ تعالیٰ کی ذات پر توکل اور اعتماد ہے۔ ہر معاملے میں اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں، وہ مجھے بے یار و مددگار نہیں چھوڑے گا:

وَ مَا اخْتَلَفْتُمْ فِیْهِ مِنْ شَیْءٍ فَحُكْمُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبِّیْ عَلَیْهِ تَوَكَّلْتُ وَ اِلَیْهِ اُنِیْبُ ○ (الشوریٰ:۱۰)

جس بات میں بھی تم نے اختلاف کیا اس کا فیصلہ اللہ کے حوالے ہے۔ وہ اللہ میرا رب ہے۔ اسی پر میں نے توکل کیا اور اسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں۔

اللہ کے رسولوں کی دعوتِ دین اور زندگی کے تمام معاملات میں انابت الی اللہ کی یہ مثالیں ہیں۔ اہل ایمان کے لیے یہ نمونہ ہیں۔ ان کے اندر بھی یہی کیفیت ہونی چاہیے۔

جن کے اندر انابت ہے ان کی اتباع کی جائے

قرآن مجید میں والدین کے ساتھ حسن سلوک کی بڑی تاکید ہے۔ ایک جگہ کہا گیا کہ وہ مشرک ہیں تو بھی ان کے ساتھ حسن سلوک کرو، لیکن اگر وہ تمھیں شرک کی راہ پر لے جانے کی کوشش کریں تو ان کا ساتھ نہ دو۔ اتباع ان لوگوں کی کرو جن کو انابت الی اللہ، حاصل ہے، جو دل و جان سے اللہ کی طرف متوجہ ہیں اور صرف اسی کی عبادت و اطاعت کر رہے ہیں۔

وَ اِن جَاهَدٰکَ عَلٰٓی اَنۡ تُشۡرِکَ بِیۡ مَا لَیۡسَ لَکَ بِهٖ عِلۡمٌ فَلَا تُطِعۡهُمَا وَ صَاحِبۡهُمَا فِی الدُّنۡیَا مَعۡرُوۡفًا ۫ وَّ اتَّبِعۡ سَبِیۡلَ مَنۡ اَنَابَ اِلَیَّ ۚ ثُمَّ اِلَیَّ مَرۡجِعُکُمۡ فَاُنَبِّئُکُمۡ بِمَا کُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ۝
(لقمان: ۱۵)

اگر وہ دونوں تم پر زور ڈالیں کہ تم میرے ساتھ کسی ایسی چیز کو شریک کرو، جس کا تمہیں علم نہیں ہے تو تم ان کی بات نہ مانو، لیکن دنیا کی زندگی میں معروف کے مطابق ان کے ساتھ حسن سلوک کرو۔ ان لوگوں کا راستہ اختیار کرو، جن کا میری طرف رجوع ہے۔ پھر تمھیں میری طرف پلٹ کر آنا ہے، اس وقت میں بتاؤں گا کہ تم کیا کر رہے تھے۔

ایک جگہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے اصحاب کے حوالے سے کہا گیا کہ اہل ایمان کا دامن کفر و شرک سے پاک ہوتا ہے۔ وہ اللہ کے دشمنوں سے کنارہ کش رہتے ہیں اور کوئی ایسا رویہ نہیں اختیار کرتے، جس سے اسلام اور مسلمانوں کے مفاد کو نقصان پہنچے۔ ان کی دعا ہوتی ہے:

رَبَّنَا عَلَیۡکَ تَوَکَّلۡنَا وَ اِلَیۡکَ اَنَبۡنَا وَ اِلَیۡکَ الۡمَصِیۡرُ ۝ رَبَّنَا لَا تَجۡعَلۡنَا فِتۡنَةً لِّلَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَاغۡفِرۡ لَنَا رَبَّنَا اِنَّکَ اَنۡتَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ ۝
(الممتحنۃ: ۴، ۵)

اے ہمارے رب ہم تجھ پر توکل کرتے ہیں، تیری ہی طرف رجوع کرتے ہیں اور تیرے ہی پاس پلٹ کر جانا ہے۔ اے ہمارے رب ہمیں کافروں کے ظلم کا نشانہ نہ بننے دے، ہماری مغفرت فرما دے ہمارے رب۔ بے شک تو زبردست اور حکمت والا ہے۔

انابت سے جنت کا استحقاق

اللہ تعالیٰ کی نعمت بھری جنت کے مستحق وہ خوش بخت انسان قرار پائیں گے، جو 'قلب سلیم' لے کر وہاں حاضر ہوں گے۔ (الشعراء: ۸۹) 'قلب سلیم' وہ ہے، جو ہر طرح کے فکری بگاڑ، غلط جذبات و احساسات اور اخلاقی کم زوریوں سے پاک ہو اور جس میں اللہ تعالیٰ پر ایمان و یقین، اس سے محبت اور اخلاص اور اس کی اطاعت کا جذبہ پرورش پا رہا ہو۔ اسے 'قلب منیب' بھی کہا گیا ہے۔ سورۂ قٓ میں ہے کہ خدا کے نافرمان جہنم میں مسلسل پہنچائے

جائیں گے، لیکن اس کا پیٹ نہیں بھرے گا۔ وہ هَلْ مِنْ مَّزِیْدٍ کی صدا لگائے گی۔ جنت متقیوں کے قریب کردی جائے گی۔ وہ اسے سامنے دیکھیں گے۔ ان سے کہا جائے گا:

هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ لِكُلِّ اَوَّابٍ حَفِيْظٍ ○ مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ وَ جَآءَ بِقَلْبٍ مُّنِيْبٍ ○ اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُلُوْدِ ○ لَهُمْ مَّا يَشَآؤُنَ فِيْهَا وَ لَدَيْنَا مَزِيْدٌ ○ (قٓ:۳۱-۳۵)

یہ ہے وہ (جنت) جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا، یہ ہر اس شخص کے لیے ہے جو اللہ کی طرف رجوع ہونے والا، اس کے قائم کردہ حدود کی حفاظت کرنے والا ہے۔ جو خدائے رحمٰن سے، اسے دیکھے بغیر خشیت رکھتا ہے اور جو 'قلب منیب' (رجوع ہونے والا دل) لے کر آیا ہے۔ اس جنت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہوجاؤ۔ یہ ہمیشہ رہنے کا دن ہے۔ ان کے لیے (یہاں) وہ سب کچھ ہے جو وہ چاہیں گے اور ہمارے پاس اس سے بھی زیادہ ہے۔

یہاں اہل ایمان کی، جو جنت کی ابدی نعمتوں کے مستحق قرار پائیں گے، بعض نمایاں صفات بیان ہوئی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ کہ وہ 'اوّاب' ہوتے ہیں[۱] یعنی وہ اللہ کی طرف کثرت سے رجوع کرتے ہیں۔ یہ ان کے ذکر، دعا، استعانت اور خوف و رجاء کی کیفیت کا بیان ہے۔ ان کی دوسری صفت یہ ہے کہ وہ اللہ کے قائم کردہ حدود کی حفاظت کرتے ہیں، کسی بھی معاملہ میں ان سے باہر قدم نہیں رکھتے۔ ان کی تیسری صفت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ، جو پردۂ غیب میں ہے، اس کا خوف اور خشیت ان میں پائی جاتی ہے۔ قرآن مجید میں اہل ایمان کا حال ایک جگہ یہ بیان ہوا ہے کہ اپنے تمام نیک اعمال اور سب کچھ اللہ کی راہ میں لگا دینے کے باوجود اس سے کانپتے رہتے ہیں۔ (المومنون:۶۰) اس سلسلے میں چوتھی خوبی یہ بیان ہوئی ہے کہ وہ 'قلب منیب' لے کر حاضر ہوں گے۔ قلب منیب ان تمام اعلیٰ صفات کا مسکن ہے، جن سے اللہ کا قرب حاصل ہوتا ہے اور یہی مردِ مومن کا اصل سرمایہ ہے۔

☆☆

---

(۱) زمخشری نے 'اوّاب' کی تفسیر 'الرجّاع الی ذکر اللہ' سے کی ہے۔ الکشاف: ۴/۲۸۰۔ امام راغب کہتے ہیں۔ اَلْاَوَّاب کالتَّوَّاب وھو الراجع الی اللہ تعالیٰ بترک المعاصی و فعل الطاعات۔ مفردات القرآن، مادہ اوب، ص: ۴۰

علامہ برہان الدین بقاعیؒ کی تفسیر نظم الدُّرر میں ربطِ آیات کا مطالعہ

ـــــــــــــــ ڈاکٹر عبیداللہ فہد فلاحی

قرآن کریم میں نظم ومناسبت علوم القرآن کا ایک اہم موضوع ہے۔مفسرین کرام کی ایک قابل لحاظ تعداد اس کی قائل رہی ہے، جب کہ بعض مفسرین اس کا انکار کرتے ہیں اور قرآن میں نظم ومناسبت کی تلاش کو کارِعبث قرار دیتے ہیں۔ علامہ بقاعیؒ کا تعلق مفسرین کے پہلے گروہ سے ہے۔ ان کی تفسیر نظم الدرر فی تناسب الآیات والسور، جو پہلے حیدرآباد، پھر قاہرہ سے ۲۲ جلدوں میں شائع ہوئی ہے، اس موضوع کی نمائندہ تفسیر ہے۔

قرآن کریم کی سورتوں اور آیتوں کے درمیان نظم ومناسبت اور ربط تلاش کرنا اوران سے مختلف معانی اور حکمتیں مستنبط کرنا اچھا معلوم ہوتا ہے، لیکن بسا اوقات اس معاملے میں بے جا تکلّف سے کام لیا جاتا ہے اور ایسی ایسی مناسبتیں بیان کی جاتی ہیں، جیسی باہم متناقض چیزوں کے درمیان بھی تلاش کی جاسکتی ہیں۔ مذکورہ تفسیر میں بھی ایسی مثالیں کثرت سے ہیں۔ ربط ومناسبت کے ذیل میں جو نکات بیان کیے جاتے ہیں ان کی حیثیت بعض اوقات لطائف کی سی معلوم ہوتی ہے۔ان پر فہم قرآن کو موقوف نہیں قرار دیا جاسکتا، کہ دعویٰ کیا جائے کہ جو شخص قرآن میں ربط ومناسبت کا قائل یا اس سے واقف نہیں ہے، وہ قرآن کے ایک حصے سے محروم ہے۔

بہر حال اس مضمون میں تفسیر 'نظم الدرر' کا ایک اچھا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ مصنف کے سوانح اور حالات پر مضمون نگار کا ایک اور مضمون سہ ماہی تحقیقات اسلامی، اپریل-جون ۲۰۱۱ء میں شائع ہو چکا ہے۔ (محمد رضی الاسلام ندوی)

علم مناسبت اور ربطِ آیات

نظم الدُّرر کا اصل امتیاز سورتوں اور آیات کے درمیان ربط کی تلاش ہے۔ یہ وہ پہلو ہے جس پر مصنف نے بھرپور توجہ دی ہے۔ مصنف نے اس سلسلہ میں نظم کے اصول بھی بیان کیے ہیں اور انھیں اپنی تفسیر میں برتا بھی ہے۔

فاضل مصنف کے مطابق علم مناسبت قرآن کا ایک اہم علم ہے جس سے ترتیب کی باریکیاں اور حکمتیں واضح ہو جاتی ہیں۔ اس علم کا بنیادی موضوع شئ مطلوب کے اجزاء کی ترتیبی مناسبت اور حکمت معلوم کرنا ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ ماقبل و مابعد کے ربط اور تعلق کی وجہ سے جو جز جہاں چسپاں ہونا چاہیے اور اس کا جو ترتیبی مقام ہونا چاہیے وہ سمجھا جا سکتا۔[۱]

علم مناسبت، فاضل مصنف کے مطابق، جملوں کی ترتیبی عدم مناسبت کو واضح کر دیتا ہے اور یہی بلاغت کی روح ہے کہ معانی تقاضائے حال کے مطابق ہوں اور اسی پہلو سے کلام کی ترتیب ہو۔ یہ مناسبت بہتر اور خوبصورت اس طرح ہو سکتی ہے کہ جس سورہ کا نظم تلاش کرنا ہے اس کا مقصود و مطلب معلوم ہو۔ اس صورت میں مناسبت کا علم سورہ کے تمام جملوں سے مقصود کی معرفت بہم پہنچاتا ہے۔ اس علم کا تفسیر میں وہی مقام ہے جو علم بیان کا نحو میں ہے۔[۲]

فاضل مصنف نے علم مناسبت کی تاریخ بھی بیان کی ہے اور اس موضوع پر جن مصنفین نے اپنی کاوشیں پیش کی ہیں ان کا حوالہ دیا ہے۔ وہ کتاب کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

> ''میں نے اس موضوع پر علامہ ابوجعفر احمد بن ابراہیم بن زبیر ثقفی غاصمی اندلسی کی کتاب 'المعلم بالبرهان فی ترتیب سور القرآن' کا مطالعہ کیا۔ اس کتاب میں بس ایک سورہ کو دوسری سورہ کے بعد لانے کی مناسبت بیان ہوئی ہے، آیات کے درمیان ربط سے مصنف نے

تعرض نہیں کیا ہے۔ میں ہر سورہ کے شروع میں، آپ دیکھیں گے، اس مصنف کے الفاظ نقل کر دوں گا، اس کے بعد مجھے امام بدرالدین محمد بن عبداللہ زرکشی مصری شافعی کی کتاب مل گئی جس کا نام انھوں نے 'البرہان فی علوم القرآن' رکھا ہے میں نے دیکھا کہ فاضل مصنف نے بھی میری کتاب کی طرح اس موضوع سے بحث کی ہے۔ اس کتاب کے دوسرے حصہ میں وہ کہتے ہیں: یہ کتاب علم مناسبت پر مشتمل ہے۔ مفسّرین نے اس فن کی مشکلات کی وجہ سے اس پر کم توجہ دی ہے، البتہ امام فخرالدین رازی نے اس سے خاطر خواہ بحث کی ہے۔ انھوں نے اپنی تفسیر میں کہا ہے کہ قرآن کے اکثر لطائف نظم و ترتیب میں پوشیدہ ہیں۔ قاضی ابوبکر بن العربی نے سراج المریدین میں لکھا ہے کہ'' قرآن کی آیات کے اس طرح باہم مربوط ہونے کا علم کہ وہ کلمۂ واحدہ کی طرح ہوجائیں، معانی میں وسعت پیدا ہوجائے، کلام مرتب و منظّم معلوم ہونے لگے، ایک مشکل اور دقیق علم ہے، لیکن یہ بڑا اہم ہے اور بجز ایک عالم کے کسی نے اسے ہاتھ لگانے کی جرأت نہ کی۔ اس نے بھی سورہ بقرہ میں یہ نظم تلاش کیا۔ پھر اللہ نے یہ دروازہ ہم پر کھول دیا، لیکن جب ہم نے اس علم کے حاملین کو نہ دیکھا اور عوام الناس کو اس میں دلچسپی لیتے ہوئے محسوس نہ کیا تو ہم نے اسے پھیلانے کی کوشش نہ کی اور اس معاملہ کو اپنے اور خدا کے درمیان رہنے دیا اور اسی کے حوالہ کر دیا''۔ زرکشی نے سلطان العلماء شیخ عزّ الدین بن عبدالسلام سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ'' مناسبت ایک عمدہ علم ہے، لیکن حسنِ ربط کے لیے شرط ہے کہ کلام متحد ہو اور اس کا اوّل و آخر باہم مربوط ہو۔ اگر کلام کے مختلف اسباب ہوں تو اس میں ربط نہیں ہوسکتا۔ اور جو کوئی اس میں ربط پیدا کرے گا وہ زبردستی کا ربط ہوگا اور ایسا ربط سطحی اور رکیک

ہوگا، جس سے ہر اچھا کلام محفوظ رہتا ہے، چہ جائے کہ وہ کلام جو احسن ہو۔ قرآن بیس بائیس برس کے عرصہ میں مختلف احکام لے کر، جو مختلف وجوہ و اسباب کے تحت دیے گئے، نازل ہوا۔ جس کلام کی حالت یہ ہو وہ باہم دگر مربوط نہیں ہوسکتا''۔ امام زرکشی کہتے ہیں کہ: ہمارے بعض محقق مشائخ کا کہنا ہے کہ 'ان لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ آیات کریمہ کے اندر تناسب مطلوب نہیں ہے، کیوں کہ وہ متفرق حالات کے لحاظ سے نازل ہوئی ہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ قرآن کی آیات حالات و وقائع کے حساب سے نازل ہوئیں اور ان کی ترتیب میں گہری حکمت کارفرما ہے۔ اس کی تمام سورتیں مرتب و منظّم ہیں اور تمام آیات کی یہ ترتیب توقیفی ہے۔ قرآن کا اعجاز اس کے واضح و دل کش اسلوب اور رعنا نظم میں پوشیدہ ہے۔ مناسب یہ ہے کہ ہر آیت کے بارے میں یہ تحقیق کی جائے کہ وہ مستقل حیثیت رکھتی ہے یا ماقبل کا تکملہ ہے۔ اگر مستقل حیثیت کی مالک ہے تو پہلے کی آیت سے اس کی مناسبت کیا ہے۔ یہ ایک شاندار علم ہے''۔[۳]

امام بقاعی کہتے ہیں کہ ابن العربی نے سراج المریدین میں جس عالمِ نظمِ قرآن کا حوالہ دیا ہے وہ ولی اللہ محمد بن احمد ملّوی منفلوطی شافعی ہیں۔ شیخ نے یہ بات مندرجہ ذیل آیات کی تفسیر میں کہی ہے:

وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ الْأَرْضِ ۔ وہی ہے جس نے تم کو زمین کا خلیفہ بنایا۔ (انعام: ۱۶۵)

وَنُرِیْدُ أَن نَّمُنَّ عَلَى الَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوا فِیْ الْأَرْضِ۔ (قصص: ۵) اور ہم ارادہ رکھتے تھے کہ احسان کریں ان لوگوں پر جو زمین میں ذلیل کر کے رکھے گئے تھے۔

فاضل مفسّر کہتے ہیں کہ امام شمس الدین محمود اصفہانی نے سورہ بقرہ آیت ۲۸۵ کی تفسیر میں امام رازی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ جو شخص اس سورت کے نظامی لطائف اور

ترتیبی بدائع پر غور کرے گا اسے یہ یقین ہو جائے گا کہ جس طرح قرآن اپنے الفاظ کی فصاحت اور معانی کی پاکیزگی میں معجزہ ہے اسی طرح نظم و ترتیب میں بھی اعجازی شاہکار ہے اور جن لوگوں نے یہ کہا ہے کہ قرآن اپنے اسلوب کی وجہ سے معجزہ ہے شاید ان کے پیش نظر یہی بات تھی، لیکن حیرت ہے کہ تمام مفسّرین نے ان لطائف کی طرف توجہ نہیں کی اور ان اسرار سے ناواقف رہے ہیں۔ اس بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ:

والنجم تستصغر الأبصار صورته

فالذنب للطرف لا للنجم في الصغر[۴]

(نگاہیں درخشاں ستارہ کو چھوٹا دیکھتی ہیں۔ اس میں قصور نگاہ کا ہے ستاروں کا نہیں)

امام بقاعی دوسرے مفسّرینِ نظم قرآن اور ماہرینِ مناسبت کا تعارف کراتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس کتاب کی تفسیر میں پورے طور پر میں نے امام ربّانی ابوالحسن علی بن احمد بن حسین التجیبی الحرالی المغربی سے استفادہ کیا ہے۔ یہ شام کے ایک شہر حماۃ کے باشندے تھے۔ انھوں نے اپنی تصنیف کا نام **مفتاح الباب المقفّل لفهم القرآن المنزّل** رکھا ہے اور دوسری تصنیف عورۃ الغفائس ہے جس میں مصنف نے 'سبعة احرف' اور ان کی قرأتوں کی تفصیل لکھی ہے اور ان کی تصنیفات کتاب التوشیہ اور کتاب التوفیہ کی کچھ متعلق فصلوں سے بھی کسبِ فیض کیا ہے۔ میں نے اس کتاب کی تصنیف میں مناسب جگہوں پر اس کتاب کا متعدد بار حوالہ دیا ہے۔ سورہ انفال کی تفسیر لکھ رہا تھا کہ حرالی کی تفسیر کا ایک حصہ جو إنّ اللّٰه اصطفٰی (آل عمران-۳۳) سے شروع ہوتا ہے، میرے ہاتھ لگ گیا۔ میں نے اسے بے نظیر پایا۔ اس میں آیات کے اندر ربط و مناسبت کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اس میں سے جو نکات مجھے پسند آئے میں نے ان کا اس تصنیف میں تذکرہ کیا ہے، بقیہ نکات اللہ نے اپنی مدد سے مجھ پر منکشف کیے۔ جب میں سورہ کہف تک پہنچا تو مجھے بتایا گیا کہ ابن النقیب حنفی کی تفسیر، جو ساٹھ جلدوں میں ہے، آیات کی مناسبت اور ربط پر لکھی گئی ہے۔ میں نے اس کا ایک حصہ طلب کیا۔ میں نے دیکھا کہ مجمل آیات اور قصص پر اس میں گفتگو کی گئی ہے، تمام آیات کا احاطہ نہیں کیا گیا ہے۔ جو

شخص میری اس تصنیف کا مطالعہ کرے گا وہ دوسری تفاسیر سے علم مناسبت کے سلسلہ میں کافی فرق محسوس کرے گا۔[۵]

مصنف کو بار بار یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ علم مناسبت ایک رفیع القدر اور عظیم الشان علم ہے اور اس سے مقصود یہ ہے کہ معانی میں رفعت و ندرت پیدا ہو، نظم و ترتیب میں انوکھا پن اور دل کشی ہو، اعلیٰ درجہ کی بلاغت ہو اور کلام کی عمارت مستحکم بنیادوں پر استوار کی گئی ہو۔ تاہم مصنف کو یہ احساس ہے کہ یہ مشکل ترین علم ہے۔ یہ وہ بحر ذخّار ہے جس کے چند موتیوں کے حصول کے لیے مفسّرین کو بڑی زحمتیں اٹھانی پڑی ہیں۔ فاضل مفسر نے چند آیات کا حوالہ بھی دیا ہے جن کا ماقبل و مابعد سے ربط ڈھونڈھنا آسان نہ تھا۔ مثال کے طور پر چند آیات ملاحظہ ہوں:

أَمْ كُنتُمْ شُهَدَاء إِذْ حَضَرَ يَعْقُوبَ الْمَوْتُ۔ (بقرہ:۱۳۳)

مندرجہ بالا آیت اور اس سے ملحق آیت کی مناسبت کو مصنف نے کافی مشکل قرار دیا ہے۔ دوسری آیت سورہ نساء کی ہے:

فَضَّلَ اللّهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ أَجْراً عَظِيْماً۔ (النساء:۹۵)

جب کہ اس سے معاً پہلے یہ آیت آ چکی تھی:

فَضَّلَ اللّهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً۔ (النساء:۹۵)

یا مثلاً سورہ ہود کی مندرجہ ذیل آیت کے ربط میں مفسرین کافی سرگرداں اور حیران رہے ہیں:

فَلاَ تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّمَّا يَعْبُدُ هَؤُلاءِ ۔ (ہود:۱۰۹)

یا مندرجہ ذیل آیت کا ربط بھی کافی پریشان کن رہا:

وَيَسْئَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ۔ (بنی اسرائیل:۸۵)

سورہ سجدہ کی آیت نمبر ۱۱ قُلْ يَتَوَفّٰكُم مَّلَكُ الْمَوْتِ اور سورۂ یٰسٓ کی آیت نمبر ۳۱ أَنَّهُمْ إِلَيْهِمْ لاَ يَرْجِعُونَ بھی مشکل ترین مقامات میں سے ہیں جن کی مناسبت میں مفسرین نے عقل کے گھوڑے دوڑائے ہیں۔[۶]

فاضل مصنف کو بھی نظم قرآن کی وادی طے کرنے میں کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ بعض آیات تو ایسی ہیں جن کا ربط تلاش کرنے میں انھیں مہینوں غور وفکر کرنا پڑا۔ ان کا دعویٰ تو یہاں تک ہے کہ میں نے ان آیات پر جو کچھ لکھا ہے انھیں آپ اپنے مطالعہ میں نہ لائیں اور پھر خود ان کا ربط ڈھونڈھیں تو آپ کو صحیح اندازہ ہوگا کہ میری تحقیقات کی قدر و قیمت کیا ہے اور مجھے ان میں کتنی دشواریاں پیش آئی ہوں گی اور یہ کہ مجھ پر اللہ کا خاص کرم اور اس کی عنایت کس طرح نازل ہوئی کہ میں ان کی مناسبت کو واضح کرسکا۔ وہ آیات یہ ہیں: ؎

وَإِذْ غَدَوْتَ مِنْ أَهْلِكَ ۔(آل عمران:۱۲۱)

وَيَسْتَفْتُونَكَ فِي النِّسَاءِ قُلِ اللَّهُ يُفْتِيكُمْ فِيهِنَّ۔(النساء:۱۲۷)

يَسْتَفْتُونَكَ قُلِ اللَّهُ يُفْتِيكُمْ فِي الْكَلَالَةِ۔(النساء:۱۷۶)

علم مناسبت کے فائدے

علمِ مناسبت کے فوائد گناتے ہوئے مصنف نے مندرجہ ذیل نکات پر خصوصی توجہ دی ہے:

۱- اس علم سے غور وفکر کی راہیں کھلتی ہیں اور صاحب تفسیر قرآن کے اس ارشاد پر عمل کرنے کی سعادت پاتا ہے:

أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَى قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا۔(محمد:۲۴)

اور جب اسے کچھ موتی ہاتھ آجاتے ہیں تو اس کا سر عجز وتشکر کے جذبہ سے بارگاہ الٰہی میں جھک جاتا ہے اور وہ پکار اٹھتا ہے:

رَبَّنَا لاَ تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِن لَّدُنكَ رَحْمَةً۔(آل عمران:۸)

پروردگار، جب تو ہمیں سیدھے راستے پر لگاچکا ہے تو پھر کہیں ہمارے دلوں کو کجی میں مبتلا نہ کردیجیو اور ہمیں اپنے خزانۂ فیض سے رحمت عطا کر۔۸

۲- اس علم سے دل میں ایمان راسخ ہوتا ہے اور دماغ میں یہ حقیقت جاگزیں ہوتی ہے کہ اعجاز کے دو طریقے ہیں: پہلا یہ کہ ہر جملہ ترکیب کے اعتبار سے نظم میں پروجائے اور دوسرا یہ کہ وہ اپنے ساتھ والے جملہ سے ترتیب کے اعتبار سے مربوط ہوجائے۔ پہلا طریقہ زیادہ سہل الحصول اور اقرب الی الفہم ہے، کیوں کہ جو شخص بھی قرآن کو سنے گا اس کے معانی سے لطف اندوز ہوگا اور اس کی سماعت کو فرحت اور نشاط حاصل ہوگا اور جس قدر وہ معنیٰ پر غور کرے گا اس کا اعجاز نمایاں ہوتا جائے گا۔ پھر اس سے آگے بڑھ کر جب وہ ایک جملہ کو دوسرے سے مربوط کرنا چاہے گا اور یہ علم اس پر پوشیدہ رہے گا تو وہ الجھن میں پڑجائے گا۔ اسے احساس ہوگا کہ جملے متضاد معانی رکھتے ہیں اور ان کے مقاصد میں فرق ہے۔ یہیں سے اسے کوفت اور دلی کرب کا احساس ہوگا اور جو نشاط اور کیف و مستی پہلے مرحلہ میں اسے حاصل ہوئی تھی وہ حیرانی و پریشانی میں تبدیل ہوجائے گی۔ اس کا ایمان متزلزل ہونے لگے گا اور اس کے یقین کو دھچکا لگے گا۔ لیکن اگر وہ غور و تدبر کو جاری رکھے اور توفیق خداوندی کی دعا کرتا رہے تو جلد ہی یہ زحمت ختم ہوجائے گی اور ربط و نظام کے اسرار و دقائق اس پر واضح ہونے لگیں گے۔[۹]

۳- اس علم سے یہ نکتہ بھی ہاتھ لگے کہ قرآن میں قصّے اور کہانیاں تکرار کے ساتھ کیوں بیان ہوئی ہیں۔ یہ گرہ بھی کھلے گی کہ کسی قصّہ میں اگر تکرار ہے تو اس کی ایک حکمت ہے۔ ایک ہی قصّہ مختلف اسباب و مقاصد کے تحت مختلف جگہوں پر بیان ہوا ہے اور وہاں قصہ کا وہی پہلو تفصیل سے بیان ہوا ہے جس سے مضمونِ سورہ کا خاص تعلق ہے۔ مقاصد کے تنوع کی وجہ سے ہر سورہ میں وہی قصّہ بیان کرنے کے لیے الفاظ مختلف و متنوع استعمال ہوئے ہیں، کہیں تقدیم ہے کہیں تاخیر، کہیں قصّہ مختصر ہے کہیں طوالت سے کام لیا گیا ہے۔ ان سارے اسالیب کو اپنانے کے باوجود وہ اصل مقصد فوت نہیں ہوا ہے جس کے لیے وہ قصّہ بیان ہوا ہے۔ یہ روابط جتنے مبہم اور مخفی تھے اس علم کے بعد وہ اتنے ہی واضح اور منکشف ہوجائیں گے۔[۱۰]

۴- اس علم کا ایک فائدہ یہ ہے کہ پورا قرآن شروع سے آخر تک مربوط ہوجاتا

ہے چنانچہ جو لوگ اس علم سے مالامال ہوئے ہیں انھیں یہ نکتہ ہاتھ لگا کہ سورۃ الناس جو قرآن کی آخری سورہ ہے، سورہ فاتحہ سے مربوط اور ہم آہنگ ہے۔ مصنف کے بقول، یہ حقیقت اس شخص پر واضح ہوگی جو ان کی تصنیف نظم الدّرر کا مطالعہ کرے گا۔[۱۱]

علم مناسبت کے بعض اصول

۱- پورے قرآن کی تمام آیات میں مناسبت معلوم کرنے کا قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ پہلے وہ مقصد اور خاص مضمون تلاش کیا جائے جس کے لیے سورہ نازل ہوئی ہے۔ اس کے بعد اس مقصد کے لیے ضروری مقدّمات اور کلیات کی جستجو کی جائے اور وہ مقدّمات اصل مضمون سے کس قدر قریب یا دور واقع ہوئے ہیں اس پر بھی دھیان دیا جائے۔ احکام و ہدایات کی تعلیم کے ضمن میں لوازم اور ناگزیر مسائل بھی زیر بحث آتے ہیں جو بلاغت کا تقاضا ہوتے ہیں۔ اگر یہ اصول ذہن میں رہے تو قرآن کے تمام اجزاء میں ربط آسانی سے تلاش کیا جا سکتا ہے۔[۱۲]

۲- ہر سورہ کا نام اس کے اصل مضمون کا ترجمان ہوتا ہے، کیوں کہ ہر چیز کے نام اور اس کے مسمّٰی میں جو مناسبت ہوتی ہے وہ اجمالی یا تفصیلی طور سے اصل مقصود کی طرف ضرور اشارہ کرتی ہے۔ ہر سورہ کا مقصود ذہن نشین رکھا جائے اور اس کے اور سورہ کے نام کے درمیان تطبیق پیدا کی جائے۔ ہر سورہ کے شروع میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی تشریح مصنف نے سورہ کے مقصود کے مطابق کی ہے۔[۱۳]

۳- ہر آیت اپنے ماقبل اور مابعد والی آیت سے مناسبت رکھتی ہے، لیکن یہ مناسبت بڑی تحقیق اور غائر تدبر چاہتی ہے۔ سرسری مطالعہ مناسبت اور نظم کی طرف رہنمائی کرنے کے لیے کافی نہیں ہوسکتا۔

۴- ہر سورہ اپنے ماقبل اور مابعد کی سورہ سے متعلق ہوتی ہے۔ سورۂ فاتحہ کا سورۂ بقرہ سے خاص تعلق ہے اور سورۃ الناس، جو قرآن کی آخری سورہ ہے، وہ بھی سورۂ فاتحہ سے مربوط ہے۔ اس طرح پورا قرآن ایک نظم اور مناسبت کے تحت ہے۔

۵- جس طرح سورۂ فاتحہ پورے قرآن کے مضامین کے خلاصے پر مشتمل ہے اسی طرح ہر سورہ کا ایک جامع عنوان ہوتا ہے جو اس سورہ کی تمام آیات کا احاطہ کرتا ہے اور ایک خاتمہ بھی ہوتا ہے جو اس سورہ کے عنوان سے مربوط اور ہم آہنگ ہوتا ہے۔ اسی لیے بسا اوقات متعدد سورتوں کے مضامین ایک سورہ میں پائے جاتے ہیں۔[۱۴]

ان اصولوں کے بعد دیکھیے کہ علامہ بقاعی نے انھیں کس طرح اپنی تفسیر میں ملحوظ رکھا ہے۔ سورۂ فاتحہ اور سورۂ بقرہ کے درمیان ربط دکھاتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ سورۂ فاتحہ میں اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ اس کے مختلف بندے صراط مستقیم کی طرف رہنمائی کی دعا کر رہے ہیں اور ہلاکت شدگان کے راستے سے بچنا چاہتے ہیں۔ پھر سورہ بقرہ کی ابتدائی آیات میں ہی اس نے بتا دیا کہ جس ہدایت کی طلب کی جارہی ہے وہ اس کتاب میں موجود ہے۔ اس کے بعد ہدایت سے ہم کنار افراد کی صفات بتائی گئیں، تاکہ ان سے متصف ہونے پر آمادگی پیدا ہو اور اس کے بعد ہدایت سے محروم لوگوں کی صفات کا تذکرہ کیا، تاکہ ان سے اجتناب کیا جائے۔ موجودہ ترتیب میں سورۂ فاتحہ کے بعد سورۂ بقرہ کو رکھنے میں سب سے بڑی حکمت یہی تھی، کیوں کہ سورۂ بقرہ کتاب الٰہی کے سلسلہ میں ہر قسم کے شکوک وشبہات کو رفع کرنے کے لیے اور اس کے ہادیانہ پہلو کو واضح کرنے کے لیے نازل کی گئی ہے۔[۱۵]

ایک دوسری جگہ سورۂ فاتحہ اور سورۂ بقرہ کے درمیان مناسبت ظاہر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ سورۂ فاتحہ میں تین قسم کے طبقات کا ذکر ہے: ہدایت یاب (اهدِنَا الصِّرَاطَ الْمُستَقِيمَ) دشمن جو عناد اور ہٹ دھرمی میں مبتلا ہیں (الْمَغضُوبِ عَلَيهِمْ) اور گم راہ (ضَالِّينَ)۔ سورۂ بقرہ کے آغاز میں بھی تین طبقات مذکور ہیں: ایک طبقہ مُتَّقِينَ کا ہے (هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ. الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيمُونَ الصَّلاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ) دوسرا طبقہ کھلّم کھلا کفر کا ارتکاب کرنے والوں کا ہے۔ یہی لوگ دراصل معاند ہیں (إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُواْ سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لاَيُؤْمِنُونَ) (بقرہ:۶) تیسرا گروپ منافقین کا ہے جنھیں سورۂ فاتحہ میں ضالّین کہا گیا

ہے۔ وَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ آمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الآخِرِ وَمَا هُم بِمُؤْمِنِيْنَ (بقرہ:۸) سورہ فاتحہ میں ان تینوں طبقوں کا تذکرہ اجمالی انداز میں ہوا تھا، سورۂ بقرہ میں اس کی تفصیل ہوگئی ہے اجمال کے بعد تفصیل قرآن کا ایک اہم اور انوکھا اسلوب ہے۔[۱۶]

سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران کے درمیان مناسبت

سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران کے درمیان کیا مناسبت ہے اور ان دونوں کے درمیان مشترک امور کیا ہیں؟ فاضل مصنف نے اس موضوع پر استاذ حرالی کے حوالہ سے تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ پھر لکھا ہے:

''اس نظام میں کوہانی سورہ (بقرہ) کو پہلے رکھنے کا راز یہ ہے کہ جب عوام الناس کی تقسیم کرتے وقت اللہ نے ان لوگوں کے تذکرہ سے سورہ کا آغاز کیا جو دین کے لیے کوہان کی مانند ہیں تو یہ نظام استوار ہوگیا اور مومنین کے ذکر سے مقصود ذہنوں سے قریب تر ہوگیا، چنانچہ فوراً ہی فرمایا: يَـٰٓأَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ۔ یہ تقریر جاری رہی، تا آں کہ بات پوری طرح واضح ہوگئی۔ پھر ان مومنین پر احسانات کا تذکرہ شروع ہوا اور ان کے باوا آدم کا مخصوص طور سے ذکر ہوا، اس کے بعد بنی اسرائیل کے مقابلہ میں عربوں پر جو احسانات کیے گئے ان کا ذکر ہوا۔ قرآن بڑی صراحت سے ربوبیت، توحید اور عبادت کا ذکر کرتا ہے، جس سے بنواسرائیل نکل بھاگے۔ اس تذکرہ کا مقصد عربوں پر خدائی احسانات کو گنانا اور انھیں نظر انداز کرنے کی پاداش میں یہودیوں کی رسوائی اور ذلت کی صراحت کرنا ہے، لیکن یہ مقصود بالذات نہیں، بلکہ ضمنی طور پر سیاق کلام کے تحت مذکور ہوا ہے۔ جب عربوں نے تزکیہ کا مقام حاصل کرلیا اور وہ مختلف انواع کے علوم و معارف کے اہل ہوگئے تو ربوبیت سے آگے بڑھ کر الوہیت کی طرف انھیں دعوت دی گئی (وَإِلَـٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ لَّا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ) جب وہ اس شرف سے بلندی پر پہنچ گئے تو انھیں عبادات کی تلقین کی اور اصولی و فروعی احکام و اعمال کے تذکرہ سے ان کی ارواح کی تطہیر کا سامان کیا، پھر اس کے بہت سے لوازم اکل و شرب اور نکاح و طلاق کے حدود و آداب

بیان ہوئے۔ جب وہ ان آداب سے متصف ہوگئے اور انھیں احساس ہوگیا کہ یہ تمام نعمتیں خدائے ذوالجلال کا عطیہ ہیں تو انھیں اسمائے حسنٰی سے آشنا کرایا گیا (اَللّٰہُ لاَ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّومُ لاَ تَاْخُذُہُ سِنَۃٌ وَلاَ نَوْمٌ) جب بندہ حرّیت کے اعلیٰ مقام تک پہنچ گیا تو قوم کی طرف واپسی کے وقت اس کی گردن میں عبودیت کا حلقہ رہنا ضروری تھا، چنانچہ بعض مناسب حال اعمال کا تذکرہ ہوا اور اکثر ان مقامات کی نشان دہی کی گئی جو احسان سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر نفقہ کا تذکرہ ہوا جو سورت کی ایک اہم بنیاد ہے اور اس سے پہلے طمانیت کی بحث ہوئی تھی، جس سے اس حقیقت کی وضاحت مقصود تھی کہ مقصد تک پہنچنے کی خواہش دنیاداری سے اجتناب کیے بغیر لاحاصل ہے، پاکیزہ رزق کے حصول پر بہت زور دیا جس کے بغیر آدمی باقی نہیں رہ سکتا، سود سے سختی سے روکا جس سے مقصود قناعت و کفاف کی زندگی بسر کرنے کی تاکید ہے، دین کے ضروری آداب، اعتماد رب اور توکل الٰہی جیسی صفات پیدا کرنے کی تلقین کی۔ قرآن نے اس سورہ کے خاتمہ پر بھی متاع دنیا کے پھندوں سے ہوشیار کیا اور ایمان وعمل کے ہتھیاروں سے مسلّح رہنے کا حکم دیا، نیز یہ بھی واضح کردیا کہ (اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا) جہاد کے بغیر یہ مسائل حل نہ ہوں گے، گمراہوں اور دین دشمنوں سے مبارزت اور قتال اس راہ کا ضروری توشہ ہے۔[۱۷]

علاّمہ بقاعی نے کس خوب صورتی سے سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران کا اندرونی نظم بیان کردیا ہے اور ان دونوں کے باہمی ربط و مناسبت کو بھی اجاگر کیا ہے۔ طرز بیان پر اگرچہ منطقی و استدلالی رنگ غالب ہے اور اصطلاحات بھی مصنف کی خودساختہ ہیں، مگر سیاق کلام سے ان کا مفہوم آسانی سے سمجھا جاسکتا ہے۔ چوں کہ یہ ایک نئے فن یا علم سے بحث کرتی ہے اس لیے مباحث کچھ دقیق ہوگئے ہیں۔

آیت آل عمران کا ربط

بہتر ہوگا کہ ان آیات کا ربط بھی دیکھ لیا جائے جو فاضل مصنف پر مہینوں کے

توقف کے بعد منکشف ہوئے، جنھیں انھوں نے اپنی تفسیر کے مقدمہ میں ذکر کیا ہے۔ ان میں سے پہلی آیت آل عمران کی ہے، جو مندرجہ ذیل ہے:

وَإِذْ غَدَوْتَ مِنْ أَهْلِكَ تُبَوِّءُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۔ (آل عمران:۱۲۱)

اے نبیؐ، مسلمانوں کے سامنے اس موقع کا ذکر کرو) جب تم صبح سویرے اپنے گھر سے نکلے تھے اور مسلمانوں کو جنگ کے لیے جا بہ جا مامور کر رہے تھے۔ اللہ ساری باتیں سنتا ہے اور وہ نہایت باخبر ہے۔

اس آیت سے پہلے دشمنانِ دین کی یہ صورت حال بیان ہوئی تھی:

إِن تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَإِن تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَفْرَحُواْ بِهَا وَإِن تَصْبِرُواْ وَتَتَّقُواْ لاَ يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئاً إِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ۔ (آل عمران:۱۲۰)

تمھارا بھلا ہوتا ہے تو ان کو بُرا معلوم ہوتا ہے اور تم پر کوئی مصیبت آتی ہے تو یہ خوش ہوتے ہیں، مگر ان کی کوئی تدبیر تمھارے خلاف کامیاب نہیں ہوسکتی بشرطے کہ تم صبر سے کام لو اور اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو۔ جو کچھ یہ کر رہے ہیں اللہ اس پر حاوی ہے۔

بہ ظاہر آخر الذکر آیت اوپر کی آیت سے کوئی ربط اور مناسبت نہیں رکھتی۔ لیکن مصنف نے اسے کس طرح مربوط کر دیا ہے، ملاحظہ ہو: ''قرآن نے پہلے منافقین کی خصلت بیان کر دی کہ یہ ہمیشہ نبی ﷺ اور اصحاب نبیؐ کے خلاف ریشہ دوانیوں میں مشغول رہتے ہیں، اگر مسلمانوں کو فتح نصیب ہو تو انھیں دلی تکلیف ہوتی ہے، کیوں کہ انھوں نے اپنا مستقبل کفار کے ساتھ وابستہ کر رکھا ہے اور جب مسلمانوں کو کوئی چوٹ پہنچتی ہے تو یہ فرحت سے کھل اٹھتے ہیں۔ منافقین کی اس حالت کا مشاہدہ صحابہ کئی مرتبہ کر چکے تھے۔ یہاں نبی کو خطاب کر کے سابق آیت کے لیے دلیل فراہم کی جا رہی ہے کہ ماضی کی تاریخ اٹھا کر دیکھو، جب تم نے میدان جنگ میں صبر و ثبات کا مظاہرہ کیا اور تقویٰ کی روش پر قائم رہے اور اس کے نتیجہ میں فتح و نصرت سے ہم کنار ہوئے تو انھیں

بڑی تکلیف ہوئی، جیسا کہ سریہ عبداللہ بن جحش میں ہوا، پھر بدر کے فیصلہ کن معرکہ میں یہی صورت پیش آئی اور غزوہ بنوقینقاع وغیرہ میں بھی تمہاری فتوحات نے انھیں مغموم اور رنجیدہ بنائے رکھا۔ اور اے نبیؐ، اس صورت حال کو بھی یاد کرو جب تمھارے اصحاب ثابت قدم نہ رہ سکے اور اس کی وجہ سے انھیں ہزیمت اٹھانی پڑی تو جنگ احد میں ان منافقین کی باچھیں کھل گئیں اور مسلمانوں کی شکست پر ان کے گھروں میں گھی کے چراغ جلائے گئے''۔[۱۸]

آیتِ نساء کا ربط

دوسری مشکل آیت سورۂ نساء کی ہے۔ قرآن کہتا ہے:

وَيَسْتَفْتُونَكَ فِي النِّسَاءِ قُلِ اللّهُ يُفْتِيكُمْ فِيهِنَّ وَمَا يُتْلىٰ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ فِي يَتَامَى النِّسَاءِ الَّلاتِي لاَتُؤْتُونَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَتَرْغَبُونَ أَن تَنكِحُوهُنَّ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الْوِلْدَانِ

وَأَن تَقُومُواْ لِلْيَتٰمىٰ بِالْقِسْطِ وَمَا تَفْعَلُواْ مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللّهَ كَانَ بِهِ عَلِيماً۔ (النساء: ۱۲۷)

لوگ تم سے عورتوں کے بارے میں پوچھتے ہیں، کہو اللہ تمھیں ان کے بارے میں بتاتا ہے اور ساتھ ہی وہ احکام بھی یاد دلاتا ہے جو پہلے سے تم کو اس کتاب میں سنائے جارہے ہیں، یعنی وہ احکام جو ان یتیم لڑکیوں کے متعلق ہیں جن کے حق تم ادا نہیں کرتے اور جن کے نکاح تم کرنے سے باز رہتے ہو (یا لالچ کی بنا پر تم خود ہی ان سے نکاح کر لینا چاہتے ہو) اور وہ احکام جو ان بچوں کے متعلق ہیں جو بے چارے کوئی زور نہیں رکھتے۔ اللہ تمھیں ہدایت کرتا ہے کہ یتیموں کے ساتھ انصاف پر قائم رہو اور جو بھلائی تم کرو گے وہ اللہ کے علم سے چھپی نہ رہ جائے گی۔

اس آیت کا ربط واضح کرتے ہوئے فاضل مصنف کہتے ہیں کہ ''اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اس کتاب میں یہ ترتیب قائم کی ہے کہ وہ پہلے اصولی وفروعی احکام نازل کرتا ہے، پھر وعدو وعید اور ترغیب وترہیب کے ذریعہ ان کی تفصیل بیان کرتا ہے اور اپنے

جبروت و کبریاء کے دلائل اور انعام و اکرام کے تذکرے کے ذریعہ ان میں نظم قائم کرتا ہے، پھرانوکھے انداز میں احکام کی تجدید و وضاحت کرتا ہے، کیوں کہ اس انداز میں مدّعا پیش کرنے سے اس کی مقبولیت بڑھ جاتی ہے اور نظم وربط سے دل بھی جلد اثر قبول کرتے ہیں،اس لیے کہ تکلیف دہ اور مشکل اعمال کی انجام دہی کے لیے انسان اسی وقت تیار ہوتا ہے جب ان کے ساتھ جزا کی بشارت اور عذاب کا خوف بھی موجود ہو اور یہ اسی وقت موثر ہوتا ہے جب بات کہنے والا قطعی انداز میں گفتگو کرے اور ایک اسلوب سے دوسرے اسلوب کی طرف اس طرح منتقل ہو کہ تمام پہلوؤں میں غایت درجہ کی مناسبت موجود ہو اور لفظی و معنوی ربط برقرار رہے۔ اس سورہ میں اللہ تعالیٰ نے احکامِ عدل بیان کیے ہیں جن کا آغاز نکاح و وراثت کے قوانین سے ہوا ہے، یہاں تک کہ خدائے ذوالجلال کی عظمت اور اسلام کا کمال پوری طرح سامنے آ گیا اور دلائل و براہین سے بات واضح ہوگئی۔ اس سورہ کا ایک اہم مضمون یتیموں اور دوسرے کم زور طبقات کے لیے وراثت کے عادلانہ و منصفانہ قوانین بیان کرنا تھا، چنانچہ ایک ایک کرکے یہ ہدایات نازل ہوئیں تاکہ بلاغت کا اسلوب تاثیر میں اضافہ کردے۔ اسی سیاق میں قرآن کی مندرجہ بالا آیت بھی نازل ہوئی‘‘۔[۱۹]

آیتِ کلالہ کا ربط

مصنف کی نقل کردہ ایک مشکل آیت یہ ہے:

يَسْتَفْتُونَكَ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ إِنِ امْرُؤٌ هَلَكَ لَيْسَ لَهُ وَلَدٌ وَلَهُ أُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ وَهُوَ يَرِثُهَا إِن لَّمْ يَكُن لَّهَا وَلَدٌ فَإِن كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ وَإِن كَانُوا إِخْوَةً رِّجَالاً وَنِسَاءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ

اے نبیؐ، لوگ تم سے کلالہ کے متعلق پوچھتے ہیں، کہو اللہ تمھیں بتاتا ہے۔ اگر کوئی شخص بے اولاد مرجائے اور اس کی ایک بہن ہو تو وہ اس کے ترکہ میں سے نصف پائے گی اور اگر بہن بے اولاد مرے تو بھائی اس کا وارث ہوگا۔ اگر میت کی وارث دو بہنیں ہوں تو وہ ترکے میں سے دو تہائی کی حق دار ہوں گی اور

حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ يُبَيِّنُ اللّهُ لَكُمْ أَن تَضِلُّواْ وَاللّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ۔ (النساء:۱۷۶)

اگر کئی بھائی بہنیں ہوں تو عورتوں کا اکہرا اور مردوں کا دوہرا حصہ ہوگا۔ اللہ تمہارے لیے احکام کی توضیح کرتا ہے تاکہ تم بھٹکتے نہ پھرو اور اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔

اس آیت سے پہلے مندرجہ ذیل آیت ہے:

فَأَمَّا الَّذِيْنَ آمَنُواْ بِاللّهِ وَاعْتَصَمُواْ بِهِ فَسَيُدْخِلُهُمْ فِيْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلٍ وَيَهْدِيْهِمْ إِلَيْهِ صِرَاطاً مُّسْتَقِيْماً۔ (النساء:۱۷۵)

اب جو لوگ اللہ پر ایمان لے آئیں گے اور اس کی پناہ ڈھونڈھ لیں گے ان کو اللہ اپنی رحمت اور اپنے فضل و کرم کے دامن میں لے لے گا اور اپنی طرف آنے کا سیدھا راستہ ان کو دکھا دے گا۔

مصنف کہتے ہیں کہ آیت مذکورہ میں قرآن نے انسانوں کے اس گروہ کا تذکرہ کیا ہے جو اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہے اور فرائض وغیرہ کے تمام احکام کو خوش دلی سے تسلیم کرتا ہے، خواہ وہ ان کی پسند کے مطابق ہوں یا مرضی کے خلاف ہوں۔ یہاں ایک طرف ان منافقین پر چوٹ کی گئی ہے جنھوں نے غیروں سے اپنا دامنِ امید وابستہ کر رکھا ہے اور دوسری طرف ان کافروں کو تہدید بھی ہے جو بعض احکام کو صحیح سمجھتے اور بعض کا انکار کر بیٹھتے ہیں، لیکن صراحت سے ایک ہی گروہ کا تذکرہ ہے۔ دوسرے گروہ کا جو استکبار و عناد سے مسلح اور دشمنی پر آمادہ ہے، اس کا تذکرہ نہیں کیا، اس کی جگہ فرائض کا ایک حکم بیان کر دیا جس سے سورہ کا آغاز ہوا تھا اور جو اس سورہ کا خاص مضمون ہے"۔[۲۰]

آگے اس کی حکمت بیان کرتے ہوئے فاضل مفسّر کہتے ہیں کہ "اس سے گویا اس امر کی جانب اشارہ کرنا ہے کہ جو شخص عورتوں اور بچوں کو وراثت میں حق دار نہیں بناتا ہے وہ درحقیقت اللہ کی عبادت سے روگردانی کرتا اور استکبار کا مظاہرہ کرتا ہے، خواہ اس حکم کے سوا وہ تمام احکام پر عمل کرتا ہو۔ جو شخص اللہ کے کسی حکم کا انکار کرے وہ صحیح معنوں میں کافر ہے، جیسے ایک شخص تمام انبیاء پر ایمان رکھے، لیکن کسی ایک نبی پر ایمان نہ لائے

تو وہ کافر ٹھہرتا ہے۔ اور اہل کتاب کے شیاطین جو اِن احکام کی صحت سے واقف مگر تمہارے خلاف حسد میں مبتلا اور تمھیں گمراہ دیکھنے کے خواہش مند ہیں، یہی چاہتے ہیں کہ تم بھی ان کی سیاہ بختی میں حصہ دار بن جاؤ۔ اسی لیے میراث اور نکاح کا تذکرہ کرنے کے بعد قرآن نے کہا کہ:

يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِن قَبْلِكُمْ۔(النساء:۲۶)

اللہ چاہتا ہے کہ تم پر ان طریقوں کو واضح کرے اور انہی طریقوں پر تمھیں چلائے جن کی پیروی تم سے پہلے گزرے ہوئے صلحاء کرتے تھے۔

اور یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ:

وَيُرِيْدُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ أَن تَمِيْلُوْا مَيْلاً عَظِيْماً۔(النساء:۲۷)

اور جو لوگ اپنی خواہش نفس کی پیروی کررہے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ تم راہ راست سے ہٹ کر دور نکل جاؤ۔

پھر یہ بھی صراحت کردی ہے کہ:

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِيْنَ أُوْتُوْا نَصِيْباً مِّنَ الْكِتٰبِ يَشْتَرُوْنَ الضَّلٰلَةَ وَيُرِيْدُوْنَ أَن تَضِلُّوْا السَّبِيْلَ. وَاللّٰهُ أَعْلَمُ بِأَعْدَائِكُمْ۔(النساء:۴۴)

تم نے ان لوگوں کو بھی دیکھا جنھیں کتاب کے علم کا کچھ حصہ دیا گیا ہے؟ وہ خود ضلالت کے خریدار بنے ہوئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ تم بھی راہ گم کردو۔

اسی لیے اس آیت پر یہ سورہ ختم ہوئی"۔[۲۱]

آگے مصنف مزید وضاحت کرتے ہیں کہ 'فرائض کی اہمیت اور اس پر خدائی توجہ کی شدت اور زور دکھانے کے لیے سورہ کی ابتدا میں بھی ان کی توضیح ہوئی، درمیان میں بھی ان کا بیان ہوا اور اس کا خاتمہ بھی اسی پر ہوا۔ مسلمانوں کو یہ دھمکی بھی دی گئی کہ مبادا ان کی صورت حال منافقین جیسی ہوجائے جن کو اہل کتاب نے گمراہ کردیا اور جن کے دلوں میں شکوک وشبہات کے تخم بودیے، انھیں ہوشیار کیا گیا کہ بعض احکام پر ایمان

اور بعض احکام کا انکار انھیں کامل کفر تک نہ پہنچا دے، کیوں کہ دین کے حصے بخرے نہیں ہو سکتے۔ جس نے بعض کا انکار کیا اس نے تمام کا انکار کیا۔ یہیں سورہ کے آخری حصہ کی مناسبت سورہ کے آغاز سے سمجھ میں آتی ہے، کیوں کہ سورہ کے آغاز میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ تمام انسان نفسِ واحد کی حیثیت رکھتے ہیں، جس کا تقاضا یہ ہے کہ ان میں تفریق نہ کی جائے، سوائے ان معاملات میں جن کی وضاحت اللہ نے کر دی ہے اور سورہ کا آخری حصّہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ مطلق وراثت میں رشتہ کی قربت کی وجہ سے مردوں اور عورتوں میں تفریق نہ ہو، بلکہ مساوات ہو، گرچہ حصے مختلف ہوں۔ گویا سورہ کا آغاز اور اختتام دونوں مل کر یہ پیغام دے رہے ہیں کہ ''اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تمھیں ایک جان سے پیدا کیا ہے، اس سے تمہارے جوڑے بنائے اور مردوں اور عورتوں کی کثیر تعداد پھیلادی ہے اور ان کے درمیان اپنی مشیت کے تحت برابر کے احکام جاری کیے۔ اب اگر کوئی استکبار کرتا ہے، خواہ وہ کسی ایک حکمِ خداوندی ہی کا انکار کرے تو قیامت کے دن خدا اس کو اس کی سزا دے گا اور اسے اللہ کے سوا کہیں سے کوئی پناہ نہ ملے گی اور اس سے بندوں کی کوئی حالت مخفی نہیں ہے''۔ کتنی زبردست مناسبت ہے کہ اختتام سورہ کی آیت میں خدا کے علم محیط کا تذکرہ ہے اور آغاز سورہ کی آیت میں خدا کا کمال قدرت مذکور ہے۔ گویا آخری آیت پہلی آیت پر دلیل ہے، کیوں کہ علمِ محیط کمالِ قدرت کو لازم ہے''۔[۲۲]

تفسیر کا تجزیہ

تفسیر نظم الدّرر کا یہ مختصر مطالعہ بتاتا ہے کہ علامہ بقاعی کے دور تک فکرِ نظم قرآن نے جو منزلیں طے کی تھیں انھوں نے ان سے آگے کی چند مزید منازل سر کیں، نظم قرآن کے چند مزید نقوش اجاگر کیے، اصول وضوابط کی تعیین کے ساتھ ان کے عملی انطباق میں مزید قرآن فہمی، تدبر وتفکر اور علمی رسائی کا ثبوت فراہم کیا۔ اس تفسیر کا اگر شیخ مخدوم علی مہائمی کی تفسیر سے موازنہ کیا جائے تو بڑے دلچسپ نکات پیش کیے جاسکتے ہیں۔ اس لحاظ

سے دونوں فضلاء میں مشابہت پائی جاتی ہے کہ دونوں ایک ہی فکر کے علم بردار اور ایک ہی راہ کے راہی ہیں۔ دونوں نے علم مناسبت کی اہمیت کو محسوس کیا اور اسی علم کی روشنی میں پورے قرآن کی تفسیر کی۔ آیات قرآنی میں ربط و مناسبت تلاش کرنے کی کوشش نے انھیں ایک صف میں لا کھڑا کیا ہے۔ ایک نے دمشق اور قاہرہ کی سرزمین کو اپنی علمی تحقیقات کا مرکز بنایا اور دوسرے نے ہند کی سرزمین کو۔ لیکن دونوں میں اس لحاظ سے امتیاز پایا جاتا ہے کہ علامہ بقاعی نے شیخ مہائمی کی بتائی ہوئی راہ پر چل کر منزلِ مقصود کے چند مزید نشانات کو دریافت کیا۔

شیخ مخدوم علی مہائمی تصوف و طریقت کی دنیا کے بادشاہ تھے۔ انھوں نے سلوک کی منزلیں طے کیں اور خلق خدا کی ہدایت و رہ نمائی کا فریضہ انجام دیا۔ یہ متصوفانہ رنگ ان کی تحریروں میں صاف جھلکتا ہے۔ تفسیر مہائمی علم طریقت کی گتھیوں کو سلجھاتی ہے۔ طرز بیان متصوفانہ اور فلسفیانہ ہے، جو عام آدمی کے مذاق و مزاج سے میل نہیں کھاتا، جب کہ علاّمہ برہان الدین بقاعی کی تفسیر پر علم شریعت کا رنگ حاوی ہے۔ وہ شافعی المسلک اور بدعت و تصوف کے مخالف تھے، سماع و غنا کی تردید میں کتابیں تصنیف کی تھیں اور ابن العربی اور ابن الفارض کے گمراہ کن افکار کا محاسبہ کر چکے تھے، چنانچہ نظم الدُّرر میں یہ شرعی گرفت موجود ہے اور موقع و محل کی مناسبت سے ان غیر اسلامی افکار و نظریات پر تنقید بھی۔ یہی وجہ ہے کہ معاصرین نے انھیں معاف نہ کیا، علماء نے ان سے بے زاری ظاہر کی اور شاید ان کے اس 'جرم' کو آج تک قابل عفو نہیں سمجھا گیا، جس کی وجہ سے تفسیری ذخیرہ میں ان کی قابل قدر اور گراں مایہ تفسیر کو بالعموم جگہ نہیں دی گئی۔

شیخ مہائمی نے ربط آیات کا اہتمام کیا تھا اور ان کی مناسبتوں کو ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی۔ علامہ بقاعی نے اس سے آگے بڑھ کر ان اصولوں کو بیان بھی کیا اور عملی طور پر اپنی تفسیر میں ان کا انطباق بھی کیا کہ ہر سورہ کا ایک خاص مضمون ہوتا ہے جو پوری سورہ میں نمایاں اور واضح ہوتا ہے۔ سورہ کے نام اور اس کے مضمون میں خاص تعلق ہوتا

ہے۔ ہر سورہ کا نام اس کے مضمون سے مربوط اور ہم آہنگ ہوتا ہے۔ مزید یہ کہ ہر سورہ میں ایک جامع عنوان ہوتا ہے جس کے گرد پوری سورہ کے مضامین ہوتے ہیں اور ہر سورہ میں ایک خاتمہ بھی ہوتا ہے جو اس جامع عنوان سے مربوط ہوتا ہے۔ اس طرح خاص مضمون، جامعہ اور خاتمہ مل کر پوری سورہ کو مربوط اور منظّم کر دیتے ہیں۔ شیخ مہائمی نے آیات کے درمیان ربط قائم کیا اور بقاعی نے آیات کے ساتھ سورتوں کے درمیان مناسبت کو بھی تلاش کیا۔ ہر سورہ اپنے ماقبل اور مابعد سورہ سے کیا مناسبت رکھتی ہے اور ان دونوں میں کیا خاص تعلق ہے، اس پر بھی فاضل مصنف نے داد تحقیق دی اور عجیب و غریب نکتے بیان کیے، جنھیں پڑھ کر قرآن کا معجزانہ پہلو مزید واضح ہوتا ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ مصنف نے قرآن کی پہلی سورہ کو آخری سورہ سے مربوط کیا اور ہر سورہ کے آغاز کو اس کے اختتام سے اس طرح مربوط کر دیا کہ سورہ کا خاص مضمون بھی نگاہوں میں رہا اور اعلیٰ درجہ کا ربط و مناسبت بھی قائم ہو گیا۔

دونوں مفسّرین نے ایک حیرت انگیز اور دلچسپ تحقیق یہ پیش کی کہ ہر سورہ میں بسم اللہ کی توضیح ان الفاظ میں کی جو سورہ کے خاص مضمون سے مربوط ہو گئے اور ان میں کہیں تکرار اور بے جا طوالت کا شائبہ نہیں ہوتا۔ نہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ فاضل مفسّر نے زبردستی ندرت و غرابت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ دراصل ان دونوں مصنفین کی ادبی صلاحیت اور قرآنی علوم پر تبحّر کی دلیل ہے۔

حواشی و مراجع

۱۔ بقاعی، نظم الدرر فی تناسب الآیات والسور، ص ۵

۲۔ حوالہ بالا، ص ۶

۳۔ حوالہ بالا، ص ۶-۸

۴۔ حوالہ بالا، ص ۹

۵۔ حوالہ بالا، ص ۹-۱۰

۶ حوالہ بالا، ص۱۳-۱۴ ۷ حوالہ بالا، ص۱۵

۸ حوالہ بالا، ص۱۴ ۹ حوالہ بالا، ص۱۳

۱۰ حوالہ بالا، ص۱۴ ۱۱ حوالہ بالا، ص۱۵-۱۶

۱۲ حوالہ بالا، ص۱۸ ۱۳ حوالہ بالا، ص۱۸-۱۹

۱۴ حوالہ بالا، ص۱۳۷ ۱۵ حوالہ بالا، ص۷۷

۱۶ حوالہ بالا، ص۱۰۲ ۱۷ حوالہ بالا، ص۱۹۲-۱۹۴

۱۸ حوالہ بالا، ص۴۱-۴۲۔ یہاں تفصیل کی گنجائش نہیں ہے ورنہ اس آیت کی تفسیر میں مفسّرین نے جو دوراز کار نکتے نکالے ہیں اور سیاق سے مربوط کرنے میں انھیں جن زحمتوں کا سامنا کرنا پڑا ہے، اگر انھیں یکجا کر دیا جائے تو علاّمہ بقاعیؒ کے ان نکات کی معنویت زیادہ نمایاں ہو سکے گی۔ تفصیل کے لیے امام رازیؒ، قاضی بیضاویؒ اور علامہ ابن کثیرؒ کی تفسیروں کے متعلقہ صفحات دیکھے جا سکتے ہیں۔

۱۹ بقاعی، نظم الدرر، الجزء الرابع، حوالہ بالا، ص۴۱۵-۴۱۶

۲۰ حوالہ بالا، ص۵۲۸

۲۱ حوالہ بالا، ص۵۳۱

۲۲ حوالہ بالا، ص۵۳۲-۵۳۳

☆☆☆

پاکستان میں
سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی کے لیے رابطہ کریں:
جناب سجاد الٰہی صاحب، A-27، لوہا مارکیٹ، مال گودام روڈ، بادامی باغ، لاہور
Tel: 0300-4682752, (R)5863609, (0)7280916
Email: Sammaradnan<talluadnan@yahoo.com>

ادارۂ تحقیق و تصنیفِ اسلامی کی چند اردو مطبوعات

	کتاب	مصنف	صفحات	قیمت
۱	معرکۂ اسلام و جاہلیت	مولانا صدرالدین اصلاحی	۱۳۷	۹۰
۲	مذہب کا اسلامی تصور	مولانا سلطان احمد اصلاحی	۵۹۱	۱۰۰
۳	مشترکہ خاندانی نظام اور نظریہ اسلام	مولانا سلطان احمد اصلاحی	۱۰۲	۴۰
۴	وحدتِ ادیان کا نظریہ اور اسلام	مولانا سلطان احمد اصلاحی	۱۹۲	۴۰
۵	آزادیٔ فکر و نظر اور اسلام	مولانا سلطان احمد اصلاحی	۱۲۸	۴۰
۶	قرآن، اہلِ کتاب اور مسلمان	ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی	۲۹۶	۷۰
۷	حضرت ابراہیم علیہ السلام	ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی	۲۰۰	۵۰
۸	اہلِ مذاہب کو قرآن کی دعوت	ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی	۸۴	۴۵
۹	کفر اور کافر قرآن کی روشنی میں	ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی		
۱۰	جرائم اور اسلام	مولانا محمد جرجیس کریمی	۲۲۴	۵۰
۱۱	مسلمانوں کی حقیقی تصویر	مولانا محمد جرجیس کریمی	۱۶۴	۵۵
۱۲	عہدِ نبوی کا نظامِ حکومت	پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی	۱۳۶	۳۰
۱۳	شیئر بازار میں سرمایہ کاری	ڈاکٹر عبدالعظیم اصلاحی	۱۵۶	۴۵

ملنے کے پتے

ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی، پوسٹ بکس نمبر-۹۳، علی گڑھ-۱

مرکزی مکتبہ اسلامی پبلیشرز، دعوت نگر ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی- ۲۵

تدوینِ حدیث اور سیرت نگاری میں نقد و تحقیق

آغاز وارتقاء

——————— جناب محمد طیب

تحقیق سے متعلق قرآنی تعلیمات

قرآن مجید نے ایسی بنیادی تعلیمات دی ہیں جن سے بامقصد تحقیق وتنقید کا ذوق امتِ مسلمہ کا اختصاص بن گیا۔ کذب وافتراء کی نشو ونما چشم پوشی اور جہالت کے ماحول میں ہوتی ہے۔ جو لوگ واقعات وروایات کو تحقیقی وتنقیدی نظر سے جانچتے ہیں، ان میں حق و صداقت پر مبنی روایات ہی مقبول ٹھہرتی ہیں۔ جھوٹی من گھڑت باتیں ایسے افراد کے ہاں نہیں پھیل سکتیں۔ قرآن مجید اہل ایمان کو تحقیقی رجحان کی تعلیم ان الفاظ میں دیتا ہے:

وَإِذَا جَآءَهُمْ أَمْرٌ مِّنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ أَذَاعُواْ بِهِ وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَى أُوْلِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنبِطُونَهُ مِنْهُمْ وَلَوْلاَ فَضْلُ اللّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطَانَ إِلاَّ قَلِيلاً. (النساء:۸۳)

جہاں انہیں کوئی خبر امن کی یا خوف کی ملی، انہوں نے اسے مشہور کرنا شروع کر دیا، حالاں کہ اگر یہ لوگ اسے رسول ﷺ اور اپنے میں سے ذمہ دار اصحاب کے حوالے کر دیتے، تو اس کی حقیقت وہ لوگ معلوم کر لیتے جو صحیح نتیجہ اخذ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت تم پر نہ ہوتی تو معدودے چند کے علاوہ تم سب شیطان کے پیروکار بن جاتے۔

اس آیت کی تفسیر میں حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں:

انکار علی من یبادر الی الامور قبل تحققها ویخبر بها ویفشیها و ینشرها وقد لایکون لها صحة۔ ؎

اس حکم میں ان لوگوں کی تردید ہے جو جلد بازی میں واقعات کو بغیر تحقیق کے لوگوں میں پھیلاتے ہیں، جب کہ بعض اوقات ان واقعات کی صحت ثابت نہیں ہوتا۔

ایک دوسرے مقام پر قرآن حکیم نے صراحۃً تحقیقِ واقعات کا حکم دیا گیا ہے:

یَآیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوا إِن جَاءکُمْ فَاسِقٌ بِنَبَأٍ فَتَبَیَّنُوا أَن تُصِیْبُوا قَوْماً بِجَھَالَةٍ فَتُصْبِحُوا عَلَی مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِیْنَ (الحجرات:٦)

ایمان والو! اگر تمہیں کوئی فاسق خبر دے تو اس کی اچھی طرح تحقیق کرلیا کرو، ایسا نہ ہو کہ نادانی میں کسی قوم کو ایذا پہنچا دو، پھر اپنے کیے پر پشیمانی اٹھاؤ۔

تحقیقی وتنقیدی جائزہ کے بغیر قبولِ واقعات اسلام کی فکری وعملی تعلیم کے خلاف ہے۔اس سلسلے میں واقعۂ افک سے بہت سی اصولی باتیں سمجھ میں آتی ہیں۔صحابہ کرام اگرچہ واقعۂ افک کو صحیح ماننے میں پس وپیش کرتے رہے۔معدودے چند کے علاوہ تمام صحابہ کرام نے اس واقعہ کو درست خیال نہ کیا، مگر اس قسم کے خلاف عقل ونقل، معاملے میں لچک دار سوچ اور بدظنی کو قرآن مجید نے سخت ناپسند کیا۔چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

لَوْلَا إِذْ سَمِعْتُمُوهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بِأَنفُسِهِمْ خَیْراً وَقَالُوا ھَذَا إِفْکٌ مُّبِیْنٌ. (النور:١٢)

اسے سنتے ہی مومن مردوں اور عورتوں نے اپنے حق میں نیک گمانی کیوں نہ کی اور کیوں نہ کہہ دیا کہ یہ تو کھلم کھلا صریح بہتان ہے۔

قرآن مجید کے درج بالا بیانات اس بات کا ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ اسلام نقد وتحقیق کے ذریعے واقعات وروایات کا جائزہ لینے کی تاکید کرتا ہے۔ہر سنی سنائی بات پر بغیر تفحص وتدبر کے یقین کرلینا اسلامی تعلیمات کے سراسر منافی ہے۔

تحقیق کے بارے میں نبوی ہدایات

سیرت رسول ﷺ سے بھی ہمیں تحقیق وتنقید کی بہترین مثالیں ملتی ہیں۔آپؐ

کے اقوال و اعمال مبارکہ سے صحابہ کرام کو علمی ذوق نصیب ہوا۔ نیز ان میں حفظ و ضبط حدیث کا بے مثال جذبہ اور ابلاغِ حدیث کی تڑپ پیدا ہوئی۔ تدوین حدیث اور سیرت نگاری کے اصول وضوابط اسوۂ رسول ﷺ نیز صحابہ و تابعین اور محدثین کی دینی خدمات کا صلہ ہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ نے متعدد پہلوؤں سے اس کی تعلیم دی ہے:

(الف) احادیث نبوی کی حفاظت کا حکم

حدیث نبوی کی تشریعی اہمیت اور اس کے ماخذ دین ہونے کی بنا پر اہل ایمان کو اس کی حفاظت کا حکم دیا گیا۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے ایک موقع پر وفد عبدالقیس کی بارگاہِ نبوی میں آمد کا ذکر کیا تو بتایا کہ حضور ﷺ نے انہیں چار باتوں کا حکم دیا اور چار باتوں سے منع کیا: اس کے بعد فرمایا:

احفظوهن و اخبرو بهن من وراء کم[۲] ان باتوں کو یاد رکھو اور جو لوگ تمہارے پیچھے ہیں ان کو بھی بتا دو۔

حدیث کو سننے، یاد کرنے اور آگے پہنچانے والے کے لیے آپ ﷺ نے یہ دعا کی ہے:

نضّر الله عبداً سمع مقالتی فحفظها ووعاها وأدّاها، فرب حامل فقهٍ غیر فقیه ورب حامل فقه الی من هو افقه منه۔[۳] اللہ تعالیٰ اس بندے کو تروتازہ رکھے جس نے میرا قول سنا پھر اسے یاد کیا اور اچھی طرح اسے محفوظ رکھا پھر اسے دوسرے تک پہنچایا۔ بہت سے حاملینِ فقہ غیر فقیہ ہوتے ہیں، اور وہ اسے اپنے سے زیادہ فہم والوں تک پہنچاتے ہیں۔

(ب) تحقیق کے بغیر کوئی بات کہنے کی ممانعت

احادیث میں تحقیق کے بغیر کوئی بات کہنے کی سخت الفاظ میں ممانعت آئی ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

کفی بالمرءِ کذباً ان یحدث بکل ما سمع۔ [۴]

انسان کے جھوٹا ہونے کے لیے یہی بات کافی ہے کہ وہ ہر سنی سنائی بات آگے بیان کردے۔

امام نوویؒ اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ففیھا الزجر عن التحدیث بکل ماسمع الانسان ،فانه یسمع فی العادة الصدق والکذب فاذا حدث بکل ماسمع فقد کذب لاخباره بما لم یکن .....۔[۵]

اس حدیث میں ہر سنی سنائی بات دوسروں سے بیان کرنے کی ممانعت ہے، انسان عموماً سچ بھی سنتا ہے اور جھوٹ بھی۔ اگر وہ ہر سنی سنائی بات بیان کرنے لگ جائے تو بسا اوقات جھوٹا ٹھہر جاتا ہے، اس لیے کہ اس کی بیان کردہ بعض باتیں خلاف حقیقت ہوتی ہیں۔

حدیث مذکور سے اس بات کی صراحت ہوتی ہے کہ نقلِ واقعات وروایات میں مکمل احتیاط کرنی چاہیے، کیوں کہ اسی کے نتیجے میں اصل حقائق دینیہ کا تحفظ ہوسکتا ہے۔

(ج) قبولِ حدیث میں حزم واحتیاط کی تعلیم

نبی کریم ﷺ نے صحت وحفاظتِ حدیث کے متعلق خدشات وخطرات سے آگاہ کرتے ہوئے فرمایا تھا:

سیکون فی آخر امتی اناس یحدثونکم بما لم تسمعوا انتم واباؤکم فایاکم وایاھم۔ [۶]

میری امت کے اخیر زمانے میں ایسے لوگ ہوں گے جو تم سے ایسی احادیث بیان کریں گے، جنہیں نہ تم نے سنا ہوگا اور نہ تمہارے آباء نے۔ ایسے لوگوں سے بچنا۔

آپؐ نے احادیث کی پہچان اور علامات کے طور پر بھی بعض باتوں کی نشاندہی فرمائی ہے۔ آپؐ کا ارشاد ہے:

اذا سمعتم الحدیث تعرفه قلوبکم وتلین له اشعارکم و ابشارکم وترون

جب تم کوئی ایسی حدیث سنو جس سے تمہارے دلوں کو انسیت ہو اور تمہارے بال و کھال اُس سے متاثر ہوں اور اپنے سے

انہ منکم قریب فانا اولکم به و اذا سمعتم الحدیث عنی تنکره قلوبکم و تنفر منه اشعارکم وابشارکم وترون انه منکم بعید فانا ابعد کم منه۔[۷]

اسے قریب سمجھو تو میں تم سے زیادہ اس کا حق دار ہوں، اور جب کوئی ایسی حدیث سنو جس کو تمہارے دل قبول نہ کریں اور تمہارے بال وکھال اس سے متوحش ہوں اور اپنے سے اس کو دور سمجھو تو میں تمہاری بہ نسبت اس سے زیادہ دور ہوں۔

جرح وتعدیل اور اُسوۂ رسول ﷺ

بہت سی احادیث و واقعات سیرت سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ خود تحقیق وتنقید اور جرح وتعدیل فرماتے تھے۔ چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

حضرت عروہ بن زبیرؒ ام المومنین حضرت عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک شخص نے نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے کی درخواست کی۔ آپؐ نے فرمایا: اسے اجازت دے دو، یہ اپنے قبیلے کا بُرا آدمی ہے۔ جب وہ آدمی آپؐ کی خدمت میں پہنچا تو آپؐ نے اس کے ساتھ نرم گفتگو فرمائی۔ بعد میں جب وہ چلا گیا تو حضرت عائشہؓ نے کہا: اے اللہ کے رسول! پہلے آپؐ نے اس کے متعلق (سخت) بات فرمائی تھی، مگر جب وہ آپؐ کے پاس آ گیا تو آپ نے نرمی اختیار کر لی، اس پر آپ ﷺ نے فرمایا:

یاعائشة: ان شر الناس منزلة یوم القیٰمة من ودعه أو ترکه الناس اتقاء فحشه۔[۸]

اے عائشہ! قیامت کے دن بدترین آدمی وہ ہوگا جس سے لوگ اُس کے شر کی وجہ سے بچیں۔

اس روایت سے خطیب بغدادی (م۴۶۳ھ) نے یہ استدلال کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جرح وتعدیل کی ہے۔[۹]

حضرت حاطب بن ابی بلتعہؓ کا مشہور واقعہ ہے کہ انھوں نے فتح مکہ سے قبل

خفیہ طریقے سے ایک خط کسی عورت کے ہاتھ قریش کو بھیجا۔ رسول اللہ ﷺ کو وحی کے ذریعے اس کی خبر لگ گئی۔ آپؐ نے حضرت علیؓ کو اس عورت کے تعاقب میں بھیجا۔ انھوں نے اس سے وہ خط حاصل کر کے خدمت رسول ﷺ میں پیش کیا۔ آپؐ نے حضرت حاطبؓ کو بلا کر ایسا کرنے کی وجہ دریافت کی۔ انھوں نے جواب دیا: ''آپ (ﷺ) کے ساتھ موجود تمام مہاجرین کے اعزّہ (مکہ مکرمہ میں) موجود ہیں جو کہ ان کے اہل وعیال کا خیال رکھتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ میں ان پر ایک احسان کر دوں، تاکہ وہ میرے اہل کا خیال رکھیں۔ میں نے یہ کام کفر وارتداد کی وجہ سے نہیں کیا اور نہ قبول اسلام کے بعد میں کفر پر راضی ہوں''۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کی بات تسلیم کرلی اور صحابہ کرام کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: یہ سچ کہہ رہے ہیں''۔[۱۰]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے بسا اوقات کسی بات پر جرح فرمائی، اطمینان کے بعد جس فرد سے جرح کی اس کی تعدیل بھی فرمائی۔ آپؐ کا یہ اسوہ علمائے امت بالخصوص محدثین کے لیے تحقیق وتنقید کی مبادیات فراہم کرتا ہے۔

صحابۂ کرام کے تحقیقی رجحانات

رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ ہی میں صحابہ کرام قبول احادیث کے سلسلے میں بہت محتاط رہتے تھے۔ جب انھیں آپؐ کے بارے میں کوئی ایسی بات پہنچتی جس پر انھیں اشکال ہوتا تو وہ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوکر دریافت کرلیا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ حضرت علیؓ یمن سے قربانی کے جانور لے کر گئے اور آپ ﷺ مدینے سے قربانی کے جانور ساتھ لے کر تشریف لے گئے۔ حضرت فاطمہؓ نے رنگین لباس پہن رکھا تھا اور وہ سرمہ بھی لگائے ہوئے تھیں۔ حضرت علیؓ کہتے ہیں: میں جلدی سے آپؐ سے پوچھنے کے لیے گیا اور میں نے خدمت میں عرض کیا کہ فاطمہ نے رنگین کپڑے پہنے ہیں اور سرمہ بھی لگایا ہے اور وہ کہتی ہیں کہ مجھے میرے والد صاحب نے ایسا کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس پر آپؐ نے (تین مرتبہ) فرمایا:

فاطمہ نے سچ کہا، میں نے اسے حکم دیا ہے۔[۱۱]

حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے کسی نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے بیٹھ کر نماز پڑھنے کے متعلق فرمایا ہے کہ ایسا کرنے سے آدھا ثواب ملتا ہے۔ وہ اس حدیث کی تصدیق کے لیے بذاتِ خود آپؐ کے پاس تشریف لے گئے اور عرض کیا: ''مجھے پتہ چلا ہے کہ آپؐ نے فرمایا ہے کہ بیٹھ کر نماز پڑھنے والے شخص کی نماز کھڑے ہو کر نماز پڑھنے والے شخص کی نماز سے (ثواب کے لحاظ سے) آدھی ہے۔ اور آپؐ خود بیٹھ کر نماز پڑھ رہے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ ہاں! (میں نے ایسا کہا ہے) لیکن میں تمہاری طرح نہیں ہوں۔''[۱۲]

حضرت عبداللہ بن عمروؓ کے سوال سے اس حقیقت کا اظہار ہوتا ہے کہ اسلام نے اپنے متبعین میں تحقیقی ذوق اور قبول واقعات و روایات میں احتیاط کی تربیت کی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ صحابہ کرام سنی سنائی باتوں پر اکتفا کرنے کے بجائے آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر تصدیق و تائید چاہتے تھے، تاکہ اصل حقیقت کا علم ہو سکے اور آپؐ کے ارشادات سے متعلق کذب و افتراء کا شائبہ نہ رہے۔ صحابہ کرامؓ احادیث کے اخذ و قبول میں بے حد محتاط تھے۔ بعض صحابہؓ اس خوف سے کہ کہیں نبی اکرم ﷺ کی ذات پاک پر کذب کی وعید کے مستحق نہ بن جائیں، روایتِ حدیث میں احتیاط کرتے تھے، نیز صحابہ کرامؓ بغیر تحقیق کے حدیث بیان کو ناجائز خیال فرماتے تھے۔ چنانچہ سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ کا فرمان ہے:

بحسب المرء من الكذب أن يحدث بكل ماسمع۔[۱۳]	انسان کے جھوٹا ہونے کے لیے کافی ہے کہ وہ ہر سنی ہوئی بات (حدیث) بیان کرنے لگے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اپنے تلامذہ کو خبردار کرتے تھے:

ان الشيطان يتمثل فى صورة الرجل فيأتى القوم فيحدثهم بالحديث من الكذب فيتفرقون فيقول الرجل:	شیطان انسان کی شکل میں ظاہر ہو کر لوگوں کے پاس جاتا ہے اور ان سے جھوٹی احادیث بیان کرتا ہے، پھر لوگ منتشر ہو جاتے ہیں

سمعت رجلاً اعرف وجهه ولا ادری ما اسمه یحدث۔[۱۴] — تو ان میں سے ایک شخص کہتا ہے کہ میں نے ایک شخص سے، جس کا چہرہ میں پہچانتا ہوں، مگر اس کا نام نہیں جانتا، یہ حدیث سنی ہے۔

بعض صحابہ کرام کو فن جرح وتعدیل کے بانی کی حیثیت حاصل ہے۔ امام حاکم حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر، حضرت علی اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہم کے متعلق لکھتے ہیں:

انهم جرحوا وعدلوا و بحثوا عن صحة الروایات و سقیمها۔ [۱۵] — انہوں نے جرح وتعدیل کی اور روایات کی صحت وضعف کے متعلق بحث فرمائی۔

اُم المؤمنین حضرت عائشہؓ سے قبول حدیث میں احتیاط وتحقیق کے کئی واقعات مروی ہیں۔ حضرت عروہ بن زبیرؒ کہتے ہیں کہ مجھے حضرت عائشہؓ نے حضرت عبداللہ بن عمروؓ کے متعلق فرمایا کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے بہت زیادہ علم حاصل کیا ہے، ان سے سوالات کیا کرو۔ عروہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ عبداللہ بن عمروؓ نے ایک حدیث بیان کی۔ میں نے حضرت عائشہؓ کے سامنے اسے دہرایا، انھوں نے حدیث کے الفاظ پر تعجب کیا اور مجھ سے کہا کہ عبداللہ سے اس حدیث کے متعلق پوچھنا، حضرت عبداللہ نے دوبارہ وہی الفاظ دہرائے۔ جب میں نے حضرت عائشہؓ کو خبر دی تو انہوں نے فرمایا: میرا گمان ہے کہ عبداللہ نے بغیر کمی بیشی کے سچ بیان کیا ہے۔ ایک دوسری روایت کے مطابق انھوں نے فرمایا:

واللّٰه لقد حفظ عبد اللّٰه بن عمرو۔[۱۶] — اللہ کی قسم! عبداللہ بن عمرو نے حدیث کو یاد رکھا۔

اس روایت سے معلوم ہوا کہ حضرت عائشہؓ نے حضرت عبداللہ بن عمروؓ کے حفظ وضبط کی تحسین فرمائی اور تحقیق حدیث کی تعلیم بھی دی۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو حضرت ابوسعید الخدریؓ سے منقول بیع کے متعلق حدیث پر شک ہوا تو انھوں نے خود ان کے پاس جا کر استفسار کیا۔ حضرت ابوسعیدؓ نے یقین دلاتے ہوئے فرمایا:

أبصرت عيناى وسمعت أذناى رسول الله ﷺ يقول : لاتبيعو الذهب بالذهب ولا تبيعوا الورق بالورق الا مثلاً بمثلٍ..... الحديث۔ ۱۷

میری دونوں آنکھوں نے دیکھا اور دونوں کانوں نے سنا کہ رسول اا للہ ﷺ نے فرمایا:'' سونے کو سونے کے بدلے او رچاندی کو چاندی کے بدلے نہ فروخت کرو، مگر برابر برابر۔

اس سے واضح ہے کہ صحابۂ کرام بعض اوقات روایات کی تحقیق کے لیے اصل راویوں تک پہنچتے تھے تا کہ روایت سے متعلق یقین وظنِ غالب حاصل ہو۔ خود حضرت ابوسعید خدریؓ کے متعلق مروی ہے کہ کسی سفر کے بعد گھر تشریف لائے۔ اہل خانہ نے ان کی ضیافت میں قربانی کے گوشت کا سالن پیش کیا۔ انھوں نے کھانے سے انکار کر دیا، کیوں کہ ان کے علم میں یہ بات تھی کہ رسول اللہ ﷺ نے قربانی کا گوشت تین دن سے زیادہ رکھنے سے منع کیا ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے بھائی حضرت قتادہ بن النعمانؓ سے جو کہ بدری صحابی تھے، جا کر سوال کیا۔ انہوں نے وضاحت کی کہ رسول اللہ ﷺ نے بعد میں قربانی کے گوشت کو تین دن سے زیادہ نہ رکھنے کی پابندی ختم کر دی تھی۔ ۱۸

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے منقول ہے کہ ایک دفعہ بشیر العدوی ۱۹ ان کے پاس آئے اور ان کے سامنے احادیث بیان کرنی شروع کیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ ان احادیث سے صرفِ نظر کرتے رہے۔ اس پر انھوں نے کہا: آپ میری بیان کردہ احادیث کیوں نہیں سنتے ؟ ابن عباسؓ نے فرمایا:

إنا كنا مرة اذا سمعنا رجلا يقول: قال رسول اللّه ﷺ ابتدرته أبصارنا و أصغينا اليه بآذاننا فلما ركب الناس الصعب والذلول لم نأخذ من الناس الا ما نعرف۔ ۲۰

ایک زمانہ تھا جب ہم کسی کو یہ کہتے ہوئے سنتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تو ہماری نگاہیں عزت و احترام سے اس کی طرف اٹھ جاتی تھیں اور ہم اس کی باتوں پر کان لگاتے تھے، مگر جب لوگ ہر طرح کی باتیں روایت کرنے لگے تو ہم بھی انھیں چھان پھٹک کر قبول کرنے لگے۔

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد صحابہ ہی میں اخذِ حدیث میں احتیاط کی ضرورت پیش آ گئی تھی۔ بالخصوص سیدنا عثمانؓ کے دور میں فتنہ سبائیت نے زور پکڑا۔ اس کے نتیجے میں سیاسی عدم استحکام پیدا ہوا اور دینی مسائل میں کذب و افتراء کی ابتدا ہوگئی۔ چنانچہ روافض، زنادقہ، خوارج اور معتزلہ جیسے گمراہ فرقوں نے اپنی تائید میں احادیث وضع کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس صورت حال کے متعلق ابن سیرینؒ فرماتے ہیں:

لم یکونوا یسألون عن الأسناد، فلما وقعت الفتنة قالوا: سمّوا لنا رجالکم ، فینظر الی أهل السنة فیؤ خذ حدیثهم ، و ینظر إلی أهل البد ع ، فلا یؤخذ حدیثهم۔[۲۱]

پہلے اصحاب علم اسناد کے متعلق نہیں پوچھا کرتے تھے۔ جب فتنہ کا دور آیا، تو وہ کہنے لگے کہ ہمارے سامنے رجال (راویوں) کے نام بیان کرو، پھر ان میں غور کیا جاتا۔ اگر وہ اہل سنت میں سے ہوتے تو ان کی احادیث قبول کی جاتی تھیں اور اگر وہ اہل بدعت میں سے ہوتے تو ان کی مرویات کو ترک کر دیا جاتا تھا۔

اس طرح تدریجاً سند اور متن کے متعلق تنقیدی اصول وضوابط کا اضافہ ہوا اور اصولِ حدیث کی تکمیل کا ارتقائی تسلسل آگے بڑھتا ہوا عہد تابعین میں داخل ہوا۔

عہد تابعین اور تحقیق حدیث وسنت

حدیث وسنت میں تحقیق کا رجحان عہد صحابہ سے ارتقا پا کر عہد تابعین میں مزید تکمیل کے مراحل سے گزرا۔ اس عہد میں راویوں کے احوال جاننے اور ان کی مرویات کو پرکھنے کی زیادہ ضرورت پیش آئی۔ اسلام کی اشاعت کے ساتھ ساتھ کذاب و وضاع افراد کی تعداد میں بتدریج اضافہ ہوتا چلا گیا۔ لہٰذا تابعین کرام نے اخذ حدیث کے لیے راویوں پر کڑی نظر رکھی اور حسب ضرورت نقد ونظر سے کام لیا۔ تابعین کی تحقیقی فکر پر تبصرہ کرتے ہوئے امام سخاویؒ لکھتے ہیں:

وتكلم في الرجال، كما قال الذهبي ، جماعة من الصحابة، ثم من التابعين كالشعبي وابن سيرين۔۲۲

ذہبیؒ نے کہا ہے کہ رجال پر بحث صحابہ میں سے ایک جماعت نے کی۔ ان کے بعد تابعین میں سے شعبی اور ابن سیرین وغیرہ نے کی۔

امام ابوحاتمؒ نے فن نقد و جرح کے تدریجی ارتقاء پر روشنی ڈالتے ہوئے بعض دوسرے تابعین کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

ثم أخذ مسلكهم (مسلك الصحابة) واستنّ بسنتهم واهتدى بهديهم فيما استنّوا من التيقّظ في الروايات ، جماعة من أهل المدينة من سادات التابعين منهم : سعيد بن المسيب والقاسم بن محمد بن أبي بكرو سالم بن عبد اللّه بن عمر وعلى بن الحسين بن علي ..... فجدّوا في حفظ السنن والرحلة فيها والتفتيش عنها والتفقه فيها۔۲۳

پھر روایات کی جانچ پڑتال کے معاملے میں صحابہ کے مسلک ، ان کے طریق ، اور ان کے دستور کو مدینہ کے کبار تابعین کی ایک جماعت نے اختیار کیا۔ ان میں سے سعید بن مسیّب، قاسم بن محمد بن ابو بکر، سالم بن عبداللہ بن عمر اور علی بن حسین بن علی ہیں۔ انھوں نے حفظ سنت ، اخذِ حدیث کے لیے اسفار، تفتیش اور تفقہ فی الحدیث کی خوب کاوشیں فرمائیں۔

امام سخاوی اور ابو حاتم وغیرہ نے تابعین وائمہ دین کی جہد کا تسلسل مربوط و منظّم طور پر پیش کیا ہے۔ تفصیل کے لیے کتاب المجروحین کا مقدمہ دیکھا جاسکتا ہے۔

تبعِ تابعین اور محدثین کے عہد میں نقد وتحقیق

تدوین واصولِ حدیث کا فن مختلف ادوار میں ارتقائی منازل سے گزرتا ہوا عہد محدثین میں داخل ہوا۔ ائمہ مجتہدین نے اپنی استطاعت کی حد تک اس میں قابلِ قدر اضافہ کیا۔ احادیث و آثار کے علمی ذخیرے کے راویان پر نقد وجرح کے اصول طے

ہوئے۔ ائمہ دین نے رجال و رواۃ کی درجہ بندی کی اور جرح وتعدیل کے قواعد میں وسعت کے ساتھ عملی اطلاق بھی ہوا۔ ذیل میں ائمہ وحفاظ حدیث کے بعض اقوال نقل کیے جاتے ہیں، تاکہ اس عہد کے تحقیقی رجحانات کا کسی قدر اندازہ ہوسکے۔

امام اوزاعیؒ فرماتے ہیں:

تعلم مالم یؤ خذ به کما تتعلم ما یؤخذ۔ ۲۴

جن روایات کو ترک کرنا ہے، ان کا علم بھی حاصل کیجیے جیسا کہ قابل قبول روایات کا علم حاصل کیا جاتا ہے۔

محقق ومحدث کے لیے بے مقصد روایات اور جھوٹ پر مبنی اقوال سے اعراض کرنا بہت ضروری ہے، لہٰذا اسے اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ مفید اور اہم بحث ہی کو ضبط تحریر میں لائے، حاطب اللیل بننے سے بچے۔ محدثین نے ایسے لوگوں کا بھی ذکر کیا ہے، جن سے بھلائی اور ہدایت کی توقع عموماً نہیں ہوتی۔ یحییٰ بن معینؒ فرماتے ہیں۔

اربعة لاتؤنس منهم رشداً: حارس الدرب و منادی القاضی و ابن المحدث ورجل یکتب فی بلده ولا یرحل فی طلب الحدیث۔ ۲۵

چار قسم کے افراد سے بھلائی کی توقع نہ رکھو۔ چوکیدار، قاضی کا منادی، محدث کا بیٹا، اور وہ آدمی جو اپنے ہی شہر میں حدیث لکھتا ہو اور طلب حدیث کے لیے سفر نہ کرتا ہو۔

سفیان ثوریؒ حلال وحرام کے متعلق قبول احادیث میں زیادہ محتاط تھے۔ ان کا قول ہے:

خذ الحلال و الحرام من المشهورین فی العلم و ما سوی ذلک فمن مشیخة۔ ۲۶

حلال وحرام (کے متعلق احادیث) علم وفضل میں شہرت رکھنے والوں سے حاصل کرو، دیگر احادیث عام مشائخ سے حاصل کرسکتے ہو۔

یحییٰ بن معینؒ نے بھی اس مفہوم کو مزید وضاحت سے بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

آلة الحديث الصدق و الشهرة والطلب، وترک البدع و اجتناب الكبائر۔ ۲۷

حدیث کی حفاظت صدق، شہرت، طلب، ترک بدعت اور کبائر سے اجتناب کرنے میں ہے۔

محدثین کرام کتابتِ حدیث میں بھی بہت احتیاط فرماتے تھے۔ وہ غیر معروف اور مجہول افراد سے سن کر احادیث نہیں لکھتے تھے، بلکہ معروف و معتمد لوگوں کی ہی روایت قبول کرتے اور ان ہی سے احادیث لکھتے تھے۔ عبداللہ بن عونؒ فرماتے ہیں:

لا نكتب الحديث الا ممن كان عندنا معروفاً بالطلب۔ ۲۸

ہم ان ہی لوگوں سے حدیث لکھتے ہیں جو ہمارے نزدیک اخذ حدیث کے معاملے میں مشہور ہوتے ہیں۔

امام مالک بن انسؒ نے بھی چار قسم کے افراد سے اخذ حدیث سے منع کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

لا يؤخذ العلم عن اربعة ويؤخذ عن سوى ذلک: لا يؤخذ من صاحب هوى يدعو الناس الى هواه، ولا من سفيه يعلن بالسفه وان كان من أروى الناس، ولا من رجل يكذب فى أحاديث الناس وان كنت لا تتهمه أن يكذب على رسول الله ﷺ، ولا من رجل له فضل وصلاح وعبادة اذا كان لا يعرف مايحدث۔ ۲۹

چار لوگوں سے علم (حدیث) نہ لیا جائے، ان کے علاوہ دیگر لوگوں سے قبول کیا جاسکتا ہے: (۱) بدعتی جو لوگوں کو اپنی خواہشات و بدعات کی طرف بلاتا ہو، (۲) بے وقوف جس کی حماقت کی شہرت ہو، اگرچہ وہ سب سے زیادہ روایات بیان کرنے والا ہو، (۳) وہ شخص جو عام لوگوں کی باتوں کے معاملے میں جھوٹ بولتا ہو، اگرچہ حدیثِ رسول ﷺ میں متہم بالکذب نہ ہو، (۴) وہ شخص جو نیک، دین دار اور عبادت گزار ہو، مگر وہ جو بیان کرے اس کی مراد کو نہ جانتا ہو۔

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ نے بھی غیر ثقہ لوگوں کی احادیث لکھنے سے منع کیا ہے، فرماتے ہیں:

یکتب الحدیث الا عن اربعة: غلّاط لایرجع و کذّاب و صاحب هوی یدعو الی بدعته ورجل لایحفظ فیحدث من حفظه۔[۳۰]

چار قسم کے لوگوں سے حدیث نہ لکھی جائے: (۱) بہت غلطیاں کرنے والا جو (اپنی غلطیوں سے) رجوع نہ کرتا ہو، (۲) بہت جھوٹ بولنے والا، (۳) بدعتی جو اپنی بدعت کا داعی ہو، (۴) وہ شخص جو حافظے سے بیان کرے، جب کہ اس کا حافظہ ٹھیک نہ ہو۔

امام شافعیؒ صحت روایت کے لیے محدث میں ضروری اوصاف کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

ویکون المحدث عالماً بالسنة، ثقة فی دینه، معروفاً بالصدق فی حدیثه، عدلاً فی ما یحدث، عالماً بما یحمل من معانی الحدیث بعیداً من الغلط۔[۳۱]

محدث کو عالمِ سنت، دینی اعتبار سے ثقہ، سچ بولنے میں مشہور، بیانِ حدیث میں عادل، معانی حدیث کا عالم اور اغلاط سے دور ہونا چاہیے۔

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

لانقبل من مدلس حدیثاً حتی یقول: سمعت أو حدثنی و من کثر تخلیطه من المحدثین۔[۳۲]

ہم مدلس راوی کی حدیث اس وقت تک قبول نہیں کرتے جب تک وہ یہ نہ کہے سمعت یعنی میں نے سنا، یا کہے حدثنی کہ مجھ سے فلاں نے بیان کیا۔ اسی طرح ہم ان محدثین کی روایتیں بھی قبول نہیں کرتے جو ضعف حافظہ کی وجہ سے روایتوں کو کثرت سے خلط ملط کرنے لگے ہوں۔

امت کے بے شمار افراد نے اپنی جہد مسلسل سے علوم دینیہ کی ترویج و تدوین کا مقدس فریضہ انجام دیا۔ بعض لوگ عہد تدوین میں رجال و اسناد کے فن میں اپنے دور کے امام تسلیم کیے گئے۔ علامہ محمد بن اسحٰق بن محمد بن مندہ نے ایسے ائمہ دین کا جائزہ پیش کیا

ہے اور تاریخی ترتیب سے ان کے اسماء درج کیے ہیں۔[۳۳] اسی طرح اصولِ حدیث کا فن بھی تدریجی مراحل سے گزرتا ہوا محدثین کے دور میں تکمیلی مرحلے میں داخل ہوا اسے مزید تقویت ملی اور اس کے قواعد وضوابط منضبط ہوئے۔

حواشی ومراجع

۱۔ ابن کثیر، ابوالفداء عماد الدین اسماعیل، تفسیر القرآن العظیم، دارالکتاب العربی بیروت، ۲۰۰۵ء، ص:۲/۳۳۲

۲۔ صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب ان الخمس من الایمان، ۵۳

۳۔ رواہ الشافعی والبیہقی، کذا فی مشکاۃ المصابیح، کتاب العلم، ج۱، ۴۸۵، حدیث نمبر ۲۲۸۔ ایک اور مختصر روایت ترمذی اور ابن ماجہ کے حوالے سے ہے۔ ص ۴۸۷

۴۔ صحیح مسلم، باب النہی عن الحدیث بکل ما سمع، ۷

۵۔ نووی، یحیی بن شرف، شرح صحیح مسلم، نور محمد کارخانہ تجارت کتب، آرام باغ، کراچی، ۱/۹

۶۔ صحیح مسلم: مقدمہ، النھی عن روایۃ الضعفاء والاحتیاط فی تحملھا، ۱۵

۷۔ صحیح ابن حبان، مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت، ۱۹۹۳ء، حدیث نمبر: ۶۳

۸۔ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب مایجوز من اغتیاب اہل الفساد والریب، ۶۰۵۴

۹۔ خطیب بغدادی، الکفایۃ فی علم الروایۃ، دارالکتب العلمیۃ، بیروت، ص:۸۳

۱۰۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ الفتح: ۴۲۷۴

۱۱۔ سنن النسائی، کتاب مناسک الحج، باب الکراھیۃ فی الثیاب المصبغۃ للمحرم، ۲۷۱۲

۱۲۔ ایضاً، کتاب قیام اللیل وتطوع النھار، باب فضل صلاۃ القائم علی صلاۃ القاعد، ۱۶۵۹

۱۳۔ صحیح مسلم، مقدمہ، باب النھی عن الحدیث بکل ما سمع، ۱۱

۱۴۔ ایضاً، باب النھی عن الروایۃ عن الضعفاء، ۱۷

۱۵۔ ابوعبداللہ الحاکم، معرفۃ علوم الحدیث، دارالکتب العلمیۃ، بیروت، ص۵۲

۱۶ صحیح بخاری، کتاب الاعتصام، باب مایذکر فی ذم الرأی وتکلف القیاس، ۷۳۰۷

۱۷ مسلم، کتاب البیوع، باب الربا، ۴۰۵۵

۱۸ سنن النسائی، کتاب الضحایا، باب الأذان فی ذلک، ۴۴۲۷

۱۹ مخضرمین میں سے تھے۔قاری اور زاہد تھے۔حضرت ابو ذرؓ،حضرت ابو الدرداءؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں۔ الذھبی، سیر اعلام النبلاء، مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت ۱۹۹۲ء، ۴/ ۳۵۱

۲۰ صحیح مسلم، مقدمہ، باب النھی عن الروایۃ عن الضعفاء والاحتیاط فی تحملھا ۲۱

۲۱ ایضاً، باب بیان ان الاسناد من الدین ۲۷

۲۲ السخاوی، ابوعبداللہ محمد بن عبدالرحمٰن، فتح المغیث، جامعۃ سلفیۃ، بنارس، ۱۹۸۷ء، ۲/ ۳۱۸

۲۳ ابن حبان، کتاب المجروحین، ۱/ ۳۸

۲۴ رامھرمزی، حسن بن عبدالرحمٰن، المحدث الفاصل، دارالفکر، بیروت، ص ۴۱۹

۲۵ خطیب البغدادی، الرحلۃ فی طلب الحدیث، دارالکتب العلمیۃ، بیروت، لبنان، ص ۸۹

۲۶ المحدث الفاصل، ص ۴۰۶

۲۷ ایضاً

۲۸ ایضاً، ص ۴۰۵

۲۹ ایضاً، ص ۴۰۳

۳۰ ابن رجب حنبلی، شرح علل الترمذی، مکتبۃ المنار، اردن، ۱۹۸۲ء، ص ۱۴۴

۳۱ المحدث الفاصل، ص ۴۰۴

۳۲ ایضاً، ص ۴۰۵

۳۳ ابن مندہ، محمد بن اسحاق، شروط الائمۃ، دارالمسلم الریاض، ۱۴۱۴ھ، ص ۳۳-۳۹

☆☆☆

بحث ونظر

نظامِ خاندان-مشترکہ یا جداگانہ؟

مولانا ولی اللہ مجید قاسمی

اسلام نے خاندانی نظام کو بڑی اہمیت دی ہے۔اس نے ہر ایسی کوشش کی حوصلہ افزائی کی ہے جس کے ذریعہ خاندان کو استحکام حاصل ہو، اور ایسے ہر طرز عمل کی مذمت اور ہمت شکنی کی ہے جو اس نظام میں خلل انداز ہو۔خاندانی نظام اللہ کی ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ وہ ایک فطری گہوارہ ہے، جہاں شفقت ومحبت بھی ملتی ہے اور باہم تعاون، ہم دردی اور پشت پناہی بھی حاصل ہوتی ہے۔بغیر خاندان کا انسان ایک کٹی ہوئی پتنگ کی طرح ہے، جس کی زندگی ہوا کے رحم وکرم پر ہوتی ہے۔

نظامِ خاندان کو مستحکم اور پائدار رکھنے کے لیے اسلامی شریعت میں اراکینِ خاندان میں سے ہر ایک کے حقوق اور فرائض تفصیل سے بیان کردیے گئے ہیں۔ والدین، اولاد، میاں بیوی، اعزا واقارب ، ہر ایک کے حدود اور حقوق متعین ہیں، تاکہ کسی کی حق تلفی نہ ہو اور ظلم وجور راہ نہ پاسکے۔عدل وانصاف پر مبنی نظام خوش گوار بھی ہوتا ہے اور دیرپا بھی، اس لیے اہم چیز ان حقوق وفرائض کی حفاظت اور خاندانی نظام کا استحکام ہے، اور مشترکہ اور جداگانہ نظام خاندان میں سے اس کے لیے جو زیادہ معاون ہو وہی بہتر ہے۔یہی وجہ ہے کہ کتاب وسنت میں ان میں سے کسی ایک طریقے کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے نہ اسے بہتر کہا گیا ہے۔اللہ کے رسول ﷺ کے عہد مبارک میں اور اس سے پہلے بھی دنیا کی دیگر قوموں کی طرح عرب میں بھی دونوں طرح کے نظام رائج تھے۔

اہلِ بیت کا گھریلو نظام

اللہ کے رسول ﷺ سے بڑھ کر رشتہ داروں کے حقوق وفرائض کی رعایت اور

حفاظت کرنے والا اور کون ہوسکتا ہے؟! اس لیے آپ نے ازواج مطہرات کو الگ الگ گھروں میں رکھا، ان کے کھانے پینے کا نظام اور مالی معاملات کو بھی ایک دوسرے سے بالکل جداگانہ رکھا، یہاں تک کہ اگر ایک کے یہاں دوسرے کا کوئی سامان ضائع ہوجاتا تو آپؐ اس کا تاوان ادا کرتے، حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ اپنی بیویوں میں سے کسی کے ہاں تھے، دوسری بیوی نے خادم کے ذریعہ پیالے میں کھانے کی کوئی چیز بھیجی۔ جس بیوی کے پاس موجود تھے انھیں یہ ناگوار گذرا۔ انھوں نے پیالہ پر ہاتھ مارا، جس سے وہ گر کر ٹوٹ گیا۔ اللہ کے رسول ﷺ نے ٹوٹے ہوئے حصہ کو ملا کر اس میں کھانے کو رکھ دیا اور گھر میں موجود لوگوں سے کہا: کھاؤ، اور خادم کو روکے رکھا۔ جب لوگ کھانے سے فارغ ہوگئے تو آپ نے دوسرا اچھا پیالہ اس خادم کو دے کر بھیج دیا اور ٹوٹا ہوا پیالہ رکھ لیا۔[۱]

ازواج مطہرات کے کھانے کے نظام کو مشترک رکھنے کی صورت میں قدرے بچت ہوسکتی تھی، اس لیے کہ دس لوگوں کا کھانا الگ الگ پکانے میں خرچ زیادہ آئے گا اور ایک جگہ پکانے میں اس کے بالمقابل کم خرچ آئے گا، لیکن اس صورت میں سوکنوں کی فطری چپقلش سے بچا جاسکتا ہے، جس کا مشاہدہ مذکورہ واقعہ میں بھی کیا جاسکتا ہے، اس لیے حقوق کی ادائی اور تلخیوں سے بچنے کے لیے رہائش اور خورد ونوش کے نظام کو الگ رکھنا ہی بہتر تھا۔ اسی پس منظر میں جب حضرت فاطمہؓ کا نکاح حضرت علیؓ سے ہوا تو آپؐ نے ان کے لیے بھی علیٰحدہ گھر کا انتظام کیا۔ وہ آپؐ کے چچیرے بھائی تھے، آپ انھیں اولاد کی طرح عزیز رکھتے تھے اور اپنی چہیتی بیٹی سے ان کا رشتہ کیا تھا، لیکن ایک کمرے پر مشتمل گھر میں ان کو ساتھ رکھنے سے ان کی انفرادیت متاثر ہوسکتی تھی۔

صحابۂ کرام کا نظامِ زندگی

صحابۂ کرام کے معاشرے کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عام طور پر جداگانہ رہائش کے نظام پر عمل پیرا تھے، چنانچہ قرآن حکیم میں ہے:

لَيْسَ عَلَى الْأَعْمَى حَرَجٌ وَلَا عَلَى الْأَعْرَجِ حَرَجٌ وَلَا عَلَى الْمَرِيضِ حَرَجٌ وَلَا عَلَى أَنفُسِكُمْ أَن تَأْكُلُوا مِن بُيُوتِكُمْ أَوْ بُيُوتِ آبَائِكُمْ أَوْ بُيُوتِ أُمَّهَاتِكُمْ أَوْ بُيُوتِ إِخْوَانِكُمْ أَوْ بُيُوتِ أَخَوَاتِكُمْ أَوْ بُيُوتِ أَعْمَامِكُمْ أَوْ بُيُوتِ عَمَّاتِكُمْ أَوْ بُيُوتِ أَخْوَالِكُمْ أَوْ بُيُوتِ خَالَاتِكُمْ أَوْ مَا مَلَكْتُم مَّفَاتِحَهُ أَوْ صَدِيقِكُمْ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَن تَأْكُلُوا جَمِيعًا أَوْ أَشْتَاتًا۔ (النور:۶۱)

نابینا، لنگڑا، بیمار اور خود تم پر کوئی گناہ نہیں ہے کہ کھانا کھاؤ اپنے گھر، یا اپنے باپ کے گھر، یا اپنی ماں کے گھر، یا اپنے بھائی کے گھر، یا اپنی بہن کے گھر، یا اپنے چچا کے گھر، یا اپنی پھوپھی کے گھر، یا اپنے ماموں کے گھر، یا اپنی خالہ کے گھر، یا ایسے لوگوں کے یہاں جن کی کنجیوں کے تم مالک ہو، یا دوست کے گھر، اور تم پر اس میں بھی کوئی حرج اور تنگی نہیں ہے کہ تم کھانا کھاؤ ایک ساتھ یا الگ الگ ہو کر۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت باپ، بھائی وغیرہ کے گھر الگ الگ ہوتے تھے، نیز ان کا خورد ونوش بھی علیٰحدہ ہوتا تھا۔

احادیث سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں عام طور پر لوگ شادی کے بعد الگ گھر بسا لیتے تھے۔ حضرت عبدالرحمان بن ابی بکرؓ کہتے ہیں کہ ایک موقع پر نبی ﷺ نے فرمایا: ''کہ جس کے گھر دو آدمیوں کا کھانا ہو وہ اپنے ساتھ ایک مہمان لیتا جائے ...'' حضرت ابوبکرؓ اپنے ساتھ تین آدمیوں کو لے کر آئے۔ عبدالرحمان کہتے ہیں کہ اس وقت ہمارے یہاں کل پانچ افراد تھے۔ میرے والدین، میں اور میری بیوی اور ایک خادم جو میرے اور میرے والد کے گھر دونوں جگہ کام کرتا تھا۔[۲]

اس روایت میں مزید یہ وضاحت بھی موجود ہے کہ حضرت ابوبکرؓ اور ان کے لڑکے عبدالرحمان الگ الگ گھروں میں رہائش پذیر تھے۔ اور اس کی بھی صراحت ہے کہ الگ رہنے کے باوجود وہ اپنے والد کی خدمت سے کنارہ کش نہیں ہوئے۔ وہ اس بات کے پابند تھے کہ والدین کی گھریلو ضروریات اور خدمات کا لحاظ رکھیں اور اس میں کوتاہی پر وہ اپنے والد کی ناراضی بھی برداشت کرتے تھے۔

بعض صحابۂ کرام مشترکہ رہائش اختیار کیے ہوئے تھے۔ ان کے حالات کا یہی تقاضا تھا اور اسی شکل میں حقوق کی ادائی اور زیر کفالت افراد کی دیکھ ریکھ ہوسکتی تھی۔

حضرت جابر بن عبداللہ کہتے ہیں:

''میرے والد شہید کردیے گئے، اور اپنے پیچھے سات یا نو لڑکیاں چھوڑ گئے۔ میں نے ایک ثیّبہ (شوہر دیدہ) عورت سے شادی کرلی۔ اللہ کے رسول ﷺ نے مجھ سے پوچھا: جابر! تمھاری شادی ہوگئی؟ میں نے کہا: ہاں- فرمایا: کنواری سے یا شوہر دیدہ سے؟ میں نے کہا: شوہر دیدہ سے- آپ نے فرمایا: کسی دوشیزہ سے شادی کیوں نہیں کی کہ تم اس سے کھیلتے، وہ تم سے کھیلتی؟ میں نے کہا: میرے والد کا انتقال ہوگیا اور وہ بیٹیاں چھوڑ گئے، مجھے اچھا نہیں لگا کہ میں انہی جیسی کوئی لڑکی لے آؤں، اس لیے میں نے ایسی عورت سے شادی کی جو ان کی دیکھ بھال کرسکے اور ان کے معاملات کو ٹھیک رکھے۔ نبی ﷺ نے فرمایا: اللہ تمھیں برکت عطا فرمائے۔''[۳]

اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت جابرؓ کے اس طرز عمل کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا اور ان کی تعریف فرمائی۔ خود اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس چیز کو اپنی نعمت قرار دیا ہے کہ کسی کے لڑکے اس کے ساتھ اور اس کے پاس رہیں:

ذَرْنِیْ وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِیْداً. وَجَعَلْتُ لَہُ مَالاً مَّمْدُوداً. وَبَنِیْنَ شُھُوداً. وَمَھَّدتُّ لَہُ تَمْھِیْداً۔ (المدثّر: ۱۱-۱۴)

چھوڑ دو مجھے اور اس شخص کو جسے میں نے اکیلا پیدا کیا اور بہت سا مال اس کو دیا اور اس کے ساتھ حاضر رہنے والے بیٹے دیے اور اس کے لیے سرداری کی راہ ہموار کی۔

مولانا مفتی محمد شفیعؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''ولید بن مغیرہ پر اللہ تعالیٰ نے جو دنیا میں انعامات مبذول فرمائے تھے، ان میں ایک یہ بھی فرمایا کہ ''بنین شھودا'' یعنی اولاد حاضر وموجود۔ اس سے معلوم ہوا کہ جیسے اولاد کا پیدا ہونا اور اس کا باقی رہنا اللہ تعالیٰ کے انعامات ہیں، اسی طرح اولاد کا اپنے پاس حاضر وموجود ہونا بھی ایک بڑا انعام ہے جو والدین کے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک اور قلب کے

سکون کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ ان کی حاضری سے اپنی خدمت اور کاروبار میں امداد کا فائدہ مزید براں ہے''۔[۴]

مشترکہ نظام قابلِ اصلاح ہے

اس سے کسی کو انکار نہیں کہ مشترکہ نظام خاندان میں بعض خرابیاں در آئی ہیں، جن کی اصلاح کی شدید ضرورت ہے۔ ان بے ضابطگیوں کے ساتھ یہ نظام فائدہ مند اور نتیجہ خیز ہونے کے بجائے ضرر رساں اور تکلیف دہ ثابت ہو رہا ہے، اور گھٹن کے اس ماحول میں ایک ساتھ زندگی گذارنا مشکل ہو رہا ہے۔ رشتوں کا احترام اور پاس ولحاظ رکھنے کی جگہ دشمنیاں جنم لے رہی ہیں، نزدیکیاں دوریوں میں تبدیل ہو رہی ہیں، ایک دوسرے کی مصیبت میں کام آنے کی جگہ اس پر خوش ہونے کا مزاج بن رہا ہے، شب و روز کی تو تو میں میں نے گھر کے سکون کو درہم برہم کر دیا ہے۔

معاملات کی خرابی

معاملات کی صفائی اور اسے ہر طرح کے لڑائی جھگڑے سے پاک رکھنے، خاص طور سے مالی معاملات میں شفافیت کی اہمیت محتاج بیان نہیں ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَآ يُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُواْ لاَ تَأْكُلُواْ أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلاَّ أَن تَكُونَ تِجَارَةً عَن تَرَاضٍ مِّنكُمْ وَلاَ تَقْتُلُواْ أَنفُسَكُمْ إِنَّ اللّهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيماً. وَمَن يَفْعَلْ ذَلِكَ عُدْوَاناً وَظُلْماً فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَاراً وَكَانَ ذَلِكَ عَلَى اللّهِ يَسِيْراً۔ (النساء:۲۹-۳۰)

ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کے مال کو باطل طریقے پر مت کھاؤ، سوائے اس کے کہ باہمی رضامندی اور خوش دلی سے تجارت کے ذریعہ کسی کا مال لیا گیا ہو اور تم اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو، بلاشبہ اللہ تم پر بہت مہربان ہے اور جو کوئی سرکشی اور ظلم کی وجہ سے ایسا کرے گا اسے ہم جلد ہی جہنم میں داخل کر دیں گے اور یہ اللہ کے لیے بہت آسان ہے۔

اور اللہ کے رسول ﷺ فرماتے ہیں:

لایدخل الجنة جسد غذّی بحرام۔۵	جس جسم کی پرورش حرام غذا سے ہوئی ہو وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا۔
الا لا یحل مال امرء الا بطیب نفسه۔۶	سن لو، کسی دوسرے کا مال اس کی خوش دلی کے بغیر حلال نہیں ہے۔

وہ مال حلال اور پاکیزہ ہے جو اپنی کمائی یا وراثت کے ذریعہ حاصل ہو، یا باہمی رضا مندی سے تجارت یا خوشی کے ساتھ تحفہ کے ذریعہ ملا ہو، یا اس کے علاوہ کسی جائز ذریعہ سے حاصل کیا گیا ہو۔ کسی کی رضا مندی اور خوش دلی کے بغیر اس کے مال کو لے لینا، یا حرام ذریعہ سے مال کمانا باطل اور روحانی خودکشی کے مترادف ہے۔ علامہ ابن کثیرؒ آیت بالا کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

وَلَا تَقْتُلُوْا اَنْفُسَكُمْ ای بارتکاب محارم الله وتعاطی معاصیه وأکل اموالکم بینکم بالباطل ۔۷	''اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو'' اس کا مطلب یہ ہے کہ حرام اور معصیت کا ارتکاب کرکے، نیز آپس میں ایک دوسرے کے مال کو باطل طریقے پر کھا کر اپنے آپ کو ہلاک نہ کرو۔

مشترک نظام خاندان میں مالیاتی پہلو سے بے ضابطگی ایک امر واقعہ ہے۔ اس نظام میں لڑائی جھگڑا، دشمنی، نفرت، الزام تراشی اور تہمت وغیرہ کی بنیادی وجہ مالی معاملات اور لین دین میں عدم شفافیت ہے، اس لیے مالی معاملات اور خورد ونوش کا نظام مشترک ہونے کی صورت میں ہر چیز معلوم اور متعین ہونی چاہیے، کوئی چیز راز اور سربستہ نہ ہو، ہر ایک کی ملکیت الگ یا متعین ہونی چاہیے اور اشتراک کے لیے کسی پر کسی قسم کا جبر اور دباؤ نہ ہو، بلکہ خوش دلی اور باہمی رضا مندی سے ایک معاہدہ کرلیا جائے، زور زبردستی اور معاشرتی جبر و دباؤ کے ذریعہ کسی کو اس نظام کے ساتھ باندھ کر رکھنا صحیح نہیں ہے۔

فضول خرچی اور لاپروائی

مال مشترک ہونے کی صورت میں ہر شخص اسے پرایا مال سمجھ کر نہایت بے احتیاطی کے ساتھ استعمال کرتا ہے۔ اسی طرح سے کھانے پینے کی چیزوں میں فضول خرچی ایک عام بات ہے۔ علاوہ ازیں اس سے خود کمانے کھانے کی جگہ دوسروں پر انحصار کا مزاج بنتا اور اپنی ذمہ داریوں سے فرار کا جذبہ پروان چڑھتا ہے۔ ناکارہ اور نکمے افراد کی تعداد بڑھتی ہے، جس کی وجہ سے کمانے والے افراد کے بوجھ میں اضافہ ہوتا ہے اور معاشی اور اقتصادی ترقی گھٹتی ہے، اس لیے ضرورت ہے کہ اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی کوشش کی جائے، اپنے ہاتھ کی کمائی کھانے کا مزاج بنایا جائے، شدید مجبوری کے بغیر دوسروں سے مالی مدد نہ لی جائے، نیز میانہ روی کی حوصلہ افزائی اور فضول خرچی کی حوصلہ شکنی کی جائے۔

نامحرم کے ساتھ خلوت

پردہ کی مشروعیت کا بنیادی مقصد عصمت وعفت کی حفاظت اور جنسی تعلقات کی پوشیدگی ہے۔ اسی مقصد کے حصول کے لیے بعض اوقات محرم مردوں کو بھی گھر میں داخل ہوتے وقت اجازت لینے کا حکم دیا گیا ہے (النور: ۵۸) اور ایسے لوگوں کی تعداد کم سے کم رکھی گئی ہے جن کے سامنے عورت کو بے حجاب آنے کی اجازت ہے (النور: ۳۱) اور وہ ایسے لوگ ہیں جن سے رشتۂ نکاح قائم کرنا عورت کے لیے ہمیشہ کے لیے حرام ہے، یا انھیں جنسی تعلقات سے آگاہی یا کوئی جنسی محرک نہیں ہوتا۔ نامحرم کے سامنے عورت کا بے حجاب آنا اور اس کے ساتھ تنہائی میں رہنا حرام ہے۔

ہمارے معاشرے میں دیور بھابھی کا آپس میں بے ہودہ مذاق اور تنہائی میں یکجائی ایک عام بات ہے، خاص کر مشترک خاندان میں اس کے مواقع زیادہ ملتے ہیں اور اسے معیوب نہیں سمجھا جاتا ہے، حالاں کہ غیروں کی نسبت اپنوں سے زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

ایاکم والدخول علی النساء، فقال رجل من الانصار یا رسول اللہ افرأیت الحمو قال الحمو الموت۔

عورتوں کے پاس جانے سے بچو، ایک انصاری نے دریافت کیا شوہر کی طرف سے غیر محرم رشتہ داروں (بھائی، بھتیجا، چچا، چچازاد بھائی وغیرہ) کا کیا حکم ہے؟ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ''ان لوگوں سے تو موت کی طرح بھاگنے کی ضرورت ہے''۔

علامہ نووی اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

ان الخوف منه أكثر من غيره والشر يتوقع منه والفتنة اكثر لتمكّنه من الوصول الى المرءة والخلوة من غير ان ينكر عليه بخلاف الاجنبی۔[۹]

دوسروں کے بالمقابل شوہر کے رشتہ داروں سے اندیشہ زیادہ ہوتا ہے، ان سے برائی کے امکانات اور فتنہ میں مبتلا ہوجانے کا خطرہ زیادہ ہوتا ہے، اس لیے کہ انھیں عورت تک رسائی اور تنہائی میں یکجائی میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی، اور اسے غلط اور برا بھی نہیں سمجھا جاتا، اس کے برخلاف دوسرے لوگوں کو ایسی چھوٹ حاصل نہیں ہوتی ہے۔

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

لاتلجوا علی المغیبات، فان الشیطان یجری من احدکم مجری الدم۔[۱۰]

جن عورتوں کے شوہر گھر پر موجود نہ ہوں ان کے یہاں مت جاؤ کیوں کہ شیطان تمھارے اندر خون کی طرح رواں ہوتا ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ اس سلسلہ میں بے پروائی اور بے حسی کو دور کیا جائے، اور اس سلسلے میں لوگوں کو حساس بنایا جائے، تاکہ ایک صالح اور برائیوں اور بے حیائیوں سے پاک معاشرہ وجود میں آئے۔

پردہ پوشی اور سامان کی حفاظت

مشترکہ نظام خاندان میں انسان کی رازداری اور PRIVACY متاثر ہوتی

ہے، اور بے تکلف اور خوش گوار ازدواجی زندگی گذارنا دشوار تر ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں شوہر کے گھر کے افراد عورت کے ساز و سامان کو مالِ مفت سمجھ کر بے رحمی سے استعمال کرتے ہیں۔ اس لیے شوہر کی ذمہ داری ہے کہ وہ عورت کو ایک الگ کمرہ مہیا کرے، جس میں وہ اس کے ساتھ بے تکلف جنسی تعلقات قائم کر سکے، نیز اس کے سامان کی حفاظت ہو سکے۔

صاحب ہدایہ لکھتے ہیں:

وعلى الزوج ان يسكنها فى دار مفردة ليس فيها أحد من أهله الا ان تختار ذٰلک ... واذا وجب حقاً لها ليس له أن يشرک غيرها فيه، لأنها تتضرّر به فانها لا تأمن على متاعها، ويمنعها عن المعاشرة مع زوجها ومن الاستمتاع۔[۱۱]

شوہر کی ذمہ داری ہے کہ وہ عورت کو الگ گھر میں رکھے، جس میں اس کے گھر کے لوگوں میں سے کوئی نہ ہو، مگر یہ کہ خود عورت ان کو رکھنا چاہیے ...اور یہ جب عورت کے حق کے طور پر واجب ہے تو شوہر کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ اس میں دوسروں کو شریک کرے، اس لیے کہ اس کی وجہ سے عورت کو پریشانی ہوگی، اس کا سامن محفوظ نہیں رہے گا، اور نہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ بے تکلف رہ سکتی ہے اور نہ اس سے لطف اندوز ہو سکتی ہے۔

اور علامہ ابن قدامہ حنبلیؒ لکھتے ہیں:

ويجب لها مسكن بدليل قوله تعالىٰ اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِنْ وُجْدِكُمْ فاذا وجبت السكنى للمطلقة فللتى فى صلب النكاح اولىٰ، قال تعالىٰ وعاشروهن بالمعروف و من المعروف ان يسكنها فى مسكن، ولانها

عورت کے لیے گھر ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اپنی وسعت کے مطابق جہاں تم رہتے ہو، وہاں ان کو بھی رکھو'' اور جب طلاق یافتہ عورت کے لیے گھر ضروری ہے تو جو عورت نکاح میں ہے اس کے لیے بدرجۂ اولیٰ گھر واجب ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ بھی ارشاد ہے ''عورتوں کے

لاتستغنی عن المسکن للاستتار عن العیون وفی التصرف والا ستمتاع وحفظ المتاع۔[۱۲]

ساتھ 'معروف' کے مطابق رہا کرو' اور 'معروف' کا تقاضا ہے کہ عورت کو ایک گھر مہیا کرو اور اس لیے بھی کہ لوگوں کی نگاہوں سے بچنے اور شوہر کے ساتھ رہنے، اور سامان کی حفاظت کے لیے ایک عورت گھر سے بے نیاز نہیں ہوسکتی ہے۔

غرض یہ کہ عصمت وعفت کی حفاظت کے لیے ضروری ہے کہ میاں بیوی کو جنسی تعلقات قائم کرنے کی آزادی اور مواقع حاصل ہوں۔ وہ دن اور رات کے جس حصے میں چاہیں اپنی ضرورت پوری کرلیں، خصوصاً نوجوان جوڑوں کے لیے ان کے سرپرستوں کی طرف سے اس سلسلہ میں پابندی مناسب نہیں ہے، بلکہ اس کے لیے انھیں آسانی اور مواقع میسر ہونے چاہیے۔ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

اذا دعا الرجل زوجته لحاجته فلتأته وان کانت علی التنور ۔[۱۳]

جب کوئی شخص اپنی بیوی کو ضرورت پوری کرنے کے لیے بلائے تو وہ فوراً آجائے، اگرچہ وہ تنور پر بیٹھی ہوئی ہو۔

حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے کسی عورت کو دیکھا تو آپ اپنی بیوی حضرت زینبؓ کے پاس آئے۔ اس وقت وہ چمڑے کو دباغت دینے میں مصروف تھیں، آپ نے انھیں بلایا اور ان سے اپنی ضرورت پوری کی۔ پھر اپنے اصحاب کے پاس آئے اور فرمایا: ''عورت شیطان کی صورت میں آتی جاتی ہے، اس لیے اگر تم میں سے کسی کی نظر دوسری عورت پر پڑ جائے تو وہ اپنی بیوی سے اپنی ضرورت پوری کرلے کہ یہ چیز اس کی پریشان خیالی کو ختم کرے گی''۔[۱۴]

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

ولانہ یحتاج الی جماعھا ومعاشرتھا فی أی وقت یتفق ، ولا یمکن ذلک مع ثالث۔[۱۵]

اور اس لیے بھی کہ شوہر کو کسی بھی وقت عورت کے ساتھ رہنے اور ہم بستری کرنے کی ضرورت پیش آسکتی ہے، اور یہ کسی تیسرے کی موجودگی میں ممکن نہیں ہے۔

میاں بیوی کی تنہائی کے لیے علیٰحدہ گھر ضروری نہیں ہے، ایک کمرے سے بھی یہ ضرورت پوری ہوسکتی ہے۔[۱۶] یہ شوہر کے حالات پر منحصر ہے۔ اگر کسی کے پاس وسعت ہوتو وہ اس انداز سے گھر بنائے کہ اس میں ایک دو کمروں پر مشتمل مختلف یونٹیں ہوں، ہر یونٹ ایک مستقل گھر کی حیثیت رکھتی ہو، اس طور پر کہ ساتھ میں کچن اور باتھ روم وغیرہ بھی ہو، بیوی شوہر کے لیے ایک یونٹ اور بالغ اولاد، والدین اور زیر کفالت دیگر رشتہ داروں کے لیے دوسری یونٹ۔ اس طرح والدین کی دیکھ ریکھ بھی ہو سکے گی اور دیگر رشتہ داروں کے حقوق کی ادائیگی بھی۔ اور آج کل یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

جداگانہ نظام کی خرابیاں

یہ صحیح ہے کہ جداگانہ رہائش کے ذریعہ بہت سی معاشرتی خرابیوں سے بچا جاسکتا ہے، لیکن اس کا تاریک پہلو یہ ہے کہ اس طرح والدین اور دیگر زیر کفالت افراد کے حقوق کی ادائی نہیں ہو پاتی اور ان کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا، وہ بالکل تنہا اور بے سہارا ہوجاتے ہیں۔ بوڑھوں کے لیے مستقل ہاسٹل کی تعمیر، جداگانہ رہائش ہی کا نتیجہ ہے، جس کا چرچا کبھی مغربی ملکوں میں تھا، لیکن اب مشرق میں بھی اس کی ابتدا ہوچکی ہے۔ جداگانہ رہائش میں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص اللہ کے خوف یا معاشرے کے ڈر سے والدین یا طلاق یافتہ بہنوں اور یتیم بھتیجوں کو اپنے ساتھ رکھ لیتا ہے، لیکن اس کے دوسرے بھائی اپنے بیوی بچوں میں مشغول ہوکر ان کو یکسر فراموش کردیتے ہیں اور والدین اپنے دوسرے بچوں کی شکل دیکھنے کے لیے بھی ترس جاتے ہیں اور کبھی والدین کی باری لگادی جاتی ہے کہ وہ چند دن ایک بیٹے کے ساتھ رہیں اس کے بعد دوسرے اور تیسرے بیٹے کے یہاں گذارہ کریں۔ یہ کیفیت والدین کے لیے، خصوصاً حساس طبیعت والوں کے لیے کس درجہ تکلیف دہ ہے، الفاظ اس کے بیان سے عاجز ہیں۔

والدین کے حقوق کی ادائی میں کوتاہی، ان سے متعلق ذمہ داریوں سے فرار، بیوہ، مطلقہ اور یتیموں کی حق تلفی ایسی خرابی ہے جو مشترکہ نظام خاندان کی تمام خرابیوں پر

بھاری ہے۔ اس لیے جداگانہ رہائش کی حوصلہ افزائی کی جگہ حقوق وفرائض کی اہمیت بیان کی جائے اور ان کی ادائی کی طرف توجہ دلائی جائے، جن کے متعلق کتاب وسنت میں واضح اور صاف لفظوں میں نہایت تاکیدی حکم دیا گیا ہے، نیز معاملات کی صفائی، پردہ کی رعایت، اجنبی کے ساتھ یکجائی سے متعلق اسلامی احکام کو رواج دیا جائے، کہ ان کی روشنی میں ہر ایک سے متعلق ذمہ داریوں اور اصول وضوابط کو صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور مشترکہ اور جداگانہ رہائش کے تعلق سے خاموشی اختیار کی گئی ہے، ان میں سے کوئی بہ ذات خود نہ تو باعث فضیلت ہے اور نہ قابل نفرت، حالات کی روشنی میں ان میں سے جس کے ذریعہ حقوق بہتر طریقے سے ادا ہوں اسے اختیار کیا جاسکتا ہے۔

بہو کی ذمہ داری

امورِ خانہ داری اور اس سے متعلق چیزیں عورت کی ذمہ داری میں شامل ہیں یا نہیں؟ یہ ایک اختلافی مسئلہ ہے۔ سلف وخلف میں سے ایک جماعت کی رائے میں گھر سے متعلق امور کی انجام دہی عورت پر واجب ہے۔ امام ابوثورؒ کہتے ہیں کہ عورت کے لیے ضروری ہے کہ وہ ہر چیز میں اپنے شوہر کی خدمت کرے۔ ۱۷ امام مالکؒ سے منقول ہے کہ شوہر کے تنگ دست ہونے کی صورت میں امور خانہ کی انجام دہی بیوی پر واجب ہے، اگرچہ اس کا تعلق کسی مال دار اور شریف گھرانے سے ہو۔ ۱۸ حنفیہ میں سے علامہ ابن ہمامؒ نے لکھا ہے کہ یہ چیزیں عورت پر اخلاقی طور پر واجب ہیں، قانونی طور پر نہیں۔ ۱۹ امام شافعیؒ، امام ابوحنیفہؒ اور بعض دوسرے فقہاء کی رائے ہے کہ یہ چیزیں عورت پر واجب نہیں ہیں۔ علامہ ابن قیمؒ نے دونوں طرح کی رایوں سے متعلق دلائل کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ واجب نہ کہنے والوں کی دلیل یہ ہے کہ عقدِ نکاح کا تقاضا صرف یہ ہے کہ مرد عورت سے صرف جنسی فائدہ حاصل کرے، اس سے خدمت لینا تقاضائے عقد کے برخلاف ہے۔ صحابیات کا امور خانہ داری کو انجام دینا ان کی طرف سے رضا کارانہ تعاون تھا، اس لیے اس طرح کے واقعات کو وجوب کے لیے دلیل بنانا صحیح

نہیں ہے اور جولوگ اسے واجب کہتے ہیں وہ درج ذیل دلیلیں پیش کرتے ہیں:

۱- جس ماحول اور معاشرہ میں قرآن نازل ہوا وہاں کے عرف اور رواج کے مطابق گھریلو کام عورت ہی سے متعلق تھے اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ۔ (البقرۃ:۲۲۸)

اور عورتوں کے لیے بھی معروف طریقے پر ویسے ہی حقوق ہیں جیسے مردوں کے حقوق ان پر ہیں۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:

الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاء بِمَا فَضَّلَ اللّهُ بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ وَبِمَا أَنفَقُواْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ۔ (النساء:۳۴)

مرد عورتوں پر قوّام ہیں، اس بنا پر کہ اللہ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے، اور اس وجہ سے کہ انھوں نے ان پر اپنا مال خرچ کیا ہے۔

اگر گھریلو کام عورت کے بجائے مرد انجام دینے لگیں تو ایسی صورت میں عورتیں قوّام ہوں گی نہ کہ مرد۔

۳-حدیث میں ہے:

اتقوا اللہ فی النساء فانھن عوان عندکم.

عورتوں کے سلسلہ میں اللہ کے ڈرو، اس لیے کہ وہ تمھارے پاس قیدی ہیں۔

اس روایت میں عورتوں کو قیدی کہا گیا ہے اور قیدی کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے مالک کی خدمت کرے اور اس کے حکم کو بجالائے۔

۴- حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ کے متعلق صحیح روایتوں میں ہے کہ وہ اپنے شوہر حضرت زبیر بن عوامؓ کے گھر کا تمام کام انجام دیا کرتی تھیں اور گھریلو کام کے علاوہ ان کے گھوڑے کی دیکھ بھال بھی کرتی تھیں، پانی ڈھوکر لاتیں، اور گھر سے کافی فاصلہ پر جا کر گھوڑے اور اونٹ کے لیے چارے کا نظم کرتی تھیں۔

۵- حضرت فاطمہؓ کے گھریلو کام کرنے اور پانی لانے کا واقعہ بہت مشہور ہے،

یہاں تک کہ جب کام کا بوجھ بہت بڑھ گیا تو وہ رسول اکرم ﷺ کے پاس ایک غلام کے لیے حاضر ہوئیں۔ اس موقع پر آں حضرت ﷺ نے انھیں سو مرتبہ **سبحان اللہ، الحمد للہ، اللہ اکبر** پڑھنے کی ترغیب دی۔

اس موقع پر آپؐ نے حضرت علیؓ سے یہ نہیں فرمایا کہ یہ تمھاری ذمہ داری ہے، فاطمہ کو پریشان کرنے کی ضرورت نہیں ہے، تم اگر گھر کا کام خود انجام نہیں دے سکتے ہو تو اس کے لیے کسی خادم یا خادمہ کا بندوبست کرو۔ اسی طرح حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ کے سر پر چارے اور گھاس کا ٹوکرا دیکھ کر آپؐ نے حضرت زبیرؓ سے یہ نہیں کہا کہ یہ اس پر ظلم ہے، یہ تمھارا کام ہے، تم اسے انجام دو، یا اس کا کوئی انتظام کرو۔

۶- دیگر صحابۂ کرام کی بیویاں بھی ان کی خدمت اور گھریلو کام انجام دیا کرتی تھیں، لیکن آپؐ نے کبھی اسے ناپسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا، بلکہ اس عرف و رواج کو باقی رکھا۔

۷- اللہ تعالیٰ نے عورت کا خرچ، کھانا، کپڑا، رہائش وغیرہ مرد پر واجب قرار دیا ہے۔ یہ چیزیں مرد کے ذمے کیوں ہیں؟ کیا صرف اس لیے کہ مرد اس سے اپنی جنسی ضرورت پوری کرتا ہے، لیکن اس میں تو عورت بھی مرد کے ساتھ شریک ہے۔ وہ بھی اپنی خواہش مرد کے ذریعہ پوری کرتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرد پر یہ ذمہ داری اس لیے ہے کہ عورت پر گھر کی ذمہ داری عائد کی گئی ہے۔[۲۰]

علامہ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں:

> ''شوہر کی خدمت عورت پر ضروری ہے یا نہیں، جیسے گھر کی صفائی ستھرائی، کھانے پینے کا نظم، اس کے جانوروں کے لیے چارہ مہیا کرنا، وغیرہ۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ واجب نہیں ہے۔ یہ ایک کم زور نقطۂ نظر ہے، جیسے کہ ان لوگوں کا قول ضعیف ہے جو کہتے ہیں کہ شوہر پر عورت کے ساتھ رہنا اور اس سے صحبت کرنا واجب نہیں ہے۔ اس لیے

کہ یہ معروف معاشرت کے برخلاف ہے اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ چیزیں عورت پر واجب ہیں اور یہی صحیح ہے''۔[٢١]

خلاصہ یہ کہ عورت پر اپنے شوہر اور اس کے ماں باپ سے متعلق خانگی ذمہ داریاں واجب ہیں، خاص کر اس وقت جب بیٹیاں سسرال چلی جائیں اور ساس کو اپنی ضروریات کے لیے تعاون کی ضرورت ہو اور تعاون ایسا ہو کہ بیٹا خود اسے انجام نہ دے سکتا ہو۔ دوسرے یہ کہ حدیث میں کہا گیا ہے کہ عورت پر شوہر کی اطاعت فرض ہے۔ اس لیے اگر شوہر اپنی بیوی کو اپنے والدین کی خدمت کا پابند بنائے تو اس صورت میں عورت کے لیے اس کی اطاعت ضروری ہے۔ فقہ حنفی کی مشہور کتاب ردالمحتار میں ہے:

وحقه عليها ان تطيعه فى كل مباح يأمرها به (الدرّ المختار) ظاهره انه عند الأمر به منه يكون واجباً عليها كأمر السلطان الرعية به۔[٢٢]	شوہر کا حق عورت پر یہ ہے کہ وہ ہر جائز کام میں اطاعت کرے جس کا شوہر اسے حکم دیتا ہے (درمختار) اس عبارت سے بہ ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ شوہر کوئی حکم دیے تو عورت پر اس کی اطاعت واجب ہے، جیسا کہ بادشاہ کی اطاعت رعایا پر واجب ہوتی ہے جب وہ کوئی حکم دے۔

حواشی ومراجع

١ صحیح بخاری، ٤٩٣/

٢ دیکھیے صحیح بخاری مع فتح الباری، ٢٦١٤/٢، کتاب المناقب، باب علامۃ النبوۃ

٣ صحیح بخاری، ١١٦٤/

٤ معارف القرآن، ٦١٤/٨، مولانا مفتی محمد شفیع، بیت الحکمت دیوبند، ١٩٨٣ء

٥ رواہ ابویعلی والبزار والطبرانی وحسنہ المنذری بعض اسانیدہ، وقال الالبانی صحیح لغیرہ۔ الترغیب والترہیب للمنذری، ٧١٤/٢، مکتبۃ المعارف

۶ مشکوٰۃ المصابیح ص ۲۵۵، کتاب البیوع، باب الغصب والعاریۃ

۷ تفسیر ابن کثیر، ۱/ ۵۸۷، اسماعیل بن کثیر الدمشقی، دار عالم الکتب الریاض، ۱۹۹۷ء

۸ صحیح بخاری، ۱۱۳۵، صحیح مسلم، ۱۳۶۰

۹ المنہاج فی شرح صحیح مسلم بن حجاج/ ۱۳۶۰، ابوزکریا یحییٰ بن شرف النووی، بیت الافکار الدولیۃ

۱۰ الجامع للترمذی مع التحفۃ، ۱/ ۱۱۸۸

۱۱ الہدایۃ، ۲/ ۴۴۱، علی بن ابی بکر المرغینانی، مکتبہ اشرفیہ دیو بند

۱۲ المغنی، ۱۱/ ۳۵۵، ابومحمد عبداللہ بن احمد بن محمد بن قدامہ، دار عالم الکتب الریاض، ۱۹۸۶ء

۱۳ الجامع للترمذی مع التحفہ، ۱۱۸۲، وقال الترمذی حسن غریب وصححہ الالبانی

۱۴ صحیح مسلم مع المنہاج، ۸۷۰، کتاب النکاح

۱۵ ردالمحتار، ۵/ ۳۲۱، محمد أمین الشہیر بابن عابدین، مکتبہ زکریا دیو بند

۱۶ دیکھیے الہدایۃ، ۲/ ۴۴۱

۱۷ زاد المعاد، ۵/ ۱۸۷، ابوعبداللہ محمد بن ابی بکر الشہیر بابن القیم الجوزیۃ، موسسۃ الرسالۃ بیروت

۱۸ فتح الباری، ۳/ ۳۸۴۵، بیت الافکار الدولیۃ

۱۹ فتح القدیر، ۴/ ۲۰۱

۲۰ دیکھیے زاد المعاد، ۵/ ۱۸۷-۱۸۸

۲۱ دیکھیے فتاویٰ ابن تیمیہ، ۲/ ۲۳۴

۲۲ ردالمحتار، ۴/ ۳۸۸

☆☆☆

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ
ایک صاحبِ طرز اسلوب نگار

ڈاکٹر محمد جاوید اصغر

مولانا سید ابوالاعلی مودودی (۱۹۰۳-۱۹۷۹ء) بنیادی طور پر نثر نگار ہیں۔ انھوں نے سنجیدہ مذہبی، علمی، سیاسی، تمدنی اور معاشی مسائل وموضوعات پر اظہار خیال کرنے کے لیے اردو ہی کو اظہار خیال کا ذریعہ بنایا ہے۔ وہ دورِ جدید میں اردو نثر کے علمی اسلوب کے بہترین نمایندے قرار پاتے ہیں کہ ان کی نثر میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جن سے اردو نثر کا علمی اسلوب عبارت ہے۔

اسلوب کی اہمیت

کسی نثر پارے میں اس کا اسلوب بھی اتنا ہی اہم ہوتا ہے جتنا اس کا مواد اور موضوع۔ اصل کمال یہ ہے کہ فن کار ہر لفظ کو بالکل اس کے صحیح مقام پر اور پوری دلالتوں کے ساتھ استعمال کرے۔ لفظوں کا برمحل استعمال ہی طرز تحریر میں انفرادیت پیدا کرتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کہتے ہیں: ''بات صرف ایک ہی انداز سے بہترین طریقے سے ادا ہوسکتی ہے، اور نثر نگار کا کام یہ ہے کہ وہ اس طرز کو تلاش کرے''[۱] گویا اسلوب کی انفرادیت خیال یا جذبات کی انفرادیت سے نہیں، بلکہ موزوں الفاظ کے انتخاب، ان کے استعمال اور طرز اظہار کی انفرادیت سے پہچانی جاتی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ بات خواہ کتنی ہی مفید کیوں نہ ہو، جب تک اچھے طریقے سے نہ کی جائے دلوں اور ذہنوں پر اپنا اثر مرتب نہیں کرسکتی۔ اچھا فن کار لفظ ومعنیٰ پر قدرت حاصل کر کے انھیں مناسب ترتیب کے ساتھ دوسروں تک پہنچاتا ہے، جس سے اس کا انفرادی اسلوب وجود میں آتا ہے اور

وہ اسلوب اس کی شخصیت کا بھی آئینہ دار ہوتا ہے۔

جب ہم کہتے ہیں کہ اسلوب مصنف کی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے یا مصنف کی مکمل شخصیت کا دوسرا نام اسلوب ہے تو ہم تسلیم کرتے ہیں کہ انسان اپنے کلام یا تحریر سے پہچانا جاتا ہے اور ہر شخص کے سوچنے اور محسوس کرنے کا انداز مختلف ہے۔ اس لیے اسلوب میں ہمیں لفظوں کی ترتیب کے پیچھے فن کار کی شخصیت بھی نظر آتی ہے۔ اور شخصیت میں اس کی ذات کے سارے زاویے شامل ہوتے ہیں۔ اس کا نصب العین، اس کا مقصد حیات، اس کا مزاج، اس کی عادات، اس کا اخلاق، طرزِ عمل اور عام شخصی رویہ، سب مل کر جو شخصیت کو پروان چڑھاتے ہیں اور وہی اس کے اسلوب میں منعکس ہوتے ہیں۔ صرف شخصیت ہی نہیں بعض اوقات مصنف کا ماحول، اس کا موضوع اس کا مقصد مل کر اس کے اسلوب کی تشکیل کرتے ہیں۔ اس لیے اسلوب کا لب و لہجہ موقع و محل، فضا کی تبدیلی، مضمون اور موضوع کی نیرنگی کی وجہ سے بدل جاتا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ رقم طراز ہیں: ''اسٹائل صرف خارجی خصائصِ تحریر کا نام نہیں، بلکہ مصنف کی شخصیت کے داخلی نقوش اور اس کا طرزِ مشاہدہ ہی نہیں، بلکہ اس کا طرزِ احساس، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر مصنف کے زمانے کی قوم، بلکہ اس کی پوری تہذیب کے نقوش کا نام ہے''۔[۲]

ادبیات عالم میں بڑے ادیبوں اور شاعروں نے اپنے خیالات کے اظہار کے لیے ہمیشہ بہترین اسالیب اختیار کیے ہیں۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں اس سے صرف جذبوں کی تسکین نہیں ہوتی، بلکہ عقل کو بھی طمانیت ملتی ہے۔ میتھیو آرنلڈ کہتا ہے: ''اچھی نثر اور اچھے اسلوب کی پہچان یہی ہے کہ مصنف کے پاس کہنے کے لیے جو کچھ بھی ہو، اسے زیادہ سے زیادہ واضح طور پر ظاہر کر سکے۔ عبارت میں تصنع اس وقت پیدا ہوتا ہے جب نثر نگار کے پاس کہنے کو کچھ نہ ہو''۔[۳]

نثر کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ ترسیل علم کا کام دیتی ہے اور اس کے ذریعے سماجی مقاصد پورے کیے جاسکتے ہیں، جو اس خاص زمانے کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔

اس لیے صاحب طرز ادیب اجتماعی علوم پر مشتمل تصانیف تخلیق کرتے ہوئے بھی اپنا رنگ اور انداز متعارف کرا دیتے ہیں۔

اردو نثر کی تاریخ پر ایک نظر

اردو برصغیر ہند میں اٹھارویں صدی عیسوی میں بول چال کی زبان تھی۔ اس کا بیش تر ادبی سرمایہ شاعری تک محدود تھا۔ اردو نثر کے دور اوّل کی اکثر کتابیں مذہبی مباحث پر مبنی ہیں۔ صوفیہ کرام نے دین متین کی تبلیغ و اشاعت کے لیے جو زبان استعمال کی وہ اگرچہ بازار بھاٹ کی زبان تھی، لیکن انھوں نے سلوک و معرفت کے بڑے بڑے نکتے آسان اسلوب میں سمجھا دیے۔ بہ قول مولوی عبدالحق: ''اردو کی ابتدائی تصانیف کا محرک اسلام کے عقائد اور تصوف کے مسائل کو ہندوستان کے عوام اور خاص طور پر نومسلموں کو سمجھانے کی ضرورت اور خواہش تھی''۔[۴] اس مقصد کے لیے زبان صاف اور سادہ استعمال کی گئی اور مذہب و تصوف کی بہت سی اصطلاحات اردو زبان کا حصہ بن گئیں۔ صوفیہ کرام کے رسائل اور ملفوظات کے بعد قرآن کریم کے اردو تراجم سے اردو زبان نے علمی و ادبی راستوں کو پالیا۔ اسی عہد میں فضلی کی کربل کتھا تخلیق ہوئی جو ایک مذہبی کتاب تھی۔ اس میں جوشِ بیان اور شدت جذبات کے باوجود اظہار میں ایسا توازن ہے کہ اس کی نثر اس دور کی معیاری نثر قرار پائی''۔[۵]

اٹھارویں صدی تک اردو نثر دو جدا جدا دھاروں میں بہہ رہی تھی۔ ایک کا منبع قرآن کے تراجم اور مذہبی تعلیمات کے لیے لکھی جانے والی تخلیقات تھیں، جن میں سادگی اور اختصار کو ملحوظ رکھا گیا تھا اور دوسرے کا مآخذ سہ نثر ظہوری تھا، جس میں عبارت آرائی، قافیہ پیمائی اور مرصّع کاری کی پیروی کی جارہی تھی۔ اس اسلوب کا مقصد محض ایک طبقے کو تفریح بہم پہنچانا تھا، جب کہ مذہبی اسلوب کی سادگی کے پیش نظر اس کا مقصود عوام الناس کو مذہبی تعلیمات سے روشناس کرانا تھا۔ یوں مذہبی نثر کا یہ اسلوب عوامی مزاج سے قریب تر اور وقتی ضرورت کا متقاضی تھا۔

انیسویں صدی کے اوائل میں فورٹ ولیم کالج کے قیام سے اردو نثر نے ایک کروٹ لی اور قصہ نگاری نے سلاست، سادگی اور سہولت اظہار کے لیے ایک بالکل نیا معیار قائم کر دیا۔ فورٹ ولیم کالج کی نثر میں تفریح اور ضرورت کو باہم ملا دیا گیا تھا۔ عبارت سادہ اور غیر شاعرانہ تو ضرور ہوگئی اور میر امن اردو کے تفریحی ادب کو آسان لکھنا بھی سکھا گئے، جو اس سے قبل مذہبی ادب کی خصوصیت تھی، لیکن اظہار ذات کی راہ ابھی تک نہیں کھلی تھی [۶] اس کے بعد مرزا غالب نے اردو نثر کو خالص شخصی جذبات و احساسات کے اظہار کا ذریعہ بنایا اور مدعا نویسی پر نہ صرف زور دیا، بلکہ اس میں ادبی حسن بھی پیدا کیا، جو اپنی جگہ ایک منفرد تجربہ تھا، لیکن یہ کاملاً ذاتی اور شخصی تجربہ تھا''۔ [۷]

صحیح معنوں میں جدید اردو نثر کی داغ بیل شاہ اسماعیل شہیدؒ کی کتاب **تقویۃ الایمان** نے ڈالی، جس میں انھوں نے اردو کے ادیب کو اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کی تربیت دی اور اردو نثر کو شخصی اظہار سے اجتماعی اظہار کی طرف راغب کرتے ہوئے نہایت سلیس و سادہ زبان استعمال کی۔ غلام رسول مہر کے خیال میں: ''اردو زبان نشوونما کے مزید مدارج طے کرنے کے بعد **تقویۃ الایمان** کو بہ لحاظ اسلوب اپنا ایک گراں بہا سرمایہ تصور کرے گی''۔ [۸] اس کتاب کی زبان دینی موضوع پر اظہار کے باوجود نہایت سادہ، شگفتہ، دل کش اور ادبیت سے معمور ہے۔ اردو زبان کے ابتدائی دور کی اس نثر پر رشک آتا ہے، کیوں کہ اس میں سادگی، سلاست، مدعا نویسی، اجتماعی قوت اور اظہار کی خوبیاں جمع ہوگئی ہیں۔ اسی لیے پروفیسر آسی ضیائی کہتے ہیں: ''سرسید کی پیش رو نثر نہ میر امن کی **باغ و بہار** ہے نہ رقعات غالب، بلکہ شاہ اسماعیل شہید کی کتاب **تقویۃ الایمان** ہے''۔ [۹] گویا اردو کی علمی نثر کو تقویت فورٹ ولیم کالج اور دلی کالج کے علاوہ شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر، شاہ عبدالعزیز، سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید کے تراجم و تخلیقات سے بھی ملی اور ان کے ذریعے جدید اردو نثر کے لیے زمین ہموار ہوئی۔

اردو نثر کو سہل، سادہ، دل نشین اور ادبیت سے معمور لہجہ جہاں مذہبی تصانیف کی بدولت ملا، وہاں اردو نثر کی ترقی کے امکانات میں مسیحی مشنریوں اور ان کی تبلیغی اور اشاعتی

سرگرمیوں نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ اردو ادب میں سیرت نگاری اور تاریخ نویسی کو فروغ اسی تحریک کی بدولت ملا۔ اسی عہد میں ''مذہب کا مطالعہ فلسفیانہ بنیادوں پر کرنے کے رجحان کا آغاز ہوا، قرآن کی عملی تعلیم پر توجہ دی گئی اور اردو نثر کے اطراف سے تصوف کا حصار ڈھایا جانے لگا''۔[۱۰]

اردو نثر کے ذریعے اجتماعی مقاصد پورے کرنے کے ساتھ ساتھ مذہب کو سائنس اور فلسفے کی روشنی میں جانچنے کی مساعی شروع ہوئیں تو سرسید احمد خاں اور ان کے رفقا کی نثر وجود میں آئی۔ سرسید نے اردو نثر میں نہ صرف علمی وفکری سلاست اظہار کی طرح ڈالی، بلکہ سائنٹی فک طرزِ اظہار کے رواج میں اہم کردار ادا کیا۔ تاریخ، مذہب، تہذیب معاشرت، سیاست، ادب اور صحافت کے موضوعات پر اردو نثر میں عام فہم انداز میں لکھا جانے لگا۔ ''سرسید نے اردو نثر کو اجتماعی مقاصد سے روشناس کیا اور اس کو سہل اور سلیس بنا کر اجتماعی زندگی کا ترجمان اور علمی مطالب کے اظہار کا وسیلہ بنا دیا''۔[۱۱] سرسید نے اردو نثر کے دامن کو وسعت تو دی، لیکن جو اسلوب تخلیق کیا اس میں بے رنگ سادگی اور کرخت منطقیت ہے۔ البتہ حالی کی سادگی میں سرسید کی نسبت لطافت اور نفاست ملتی ہے۔ لیکن حالی کا استدلال شاعرانہ ہے، جو عقل کو متاثر نہیں کرتا۔ شبلی کی نثر میں چاشنی، دل کشی اور رعنائی ضرور ہے، لیکن ان کی تحریر میں شخصی عنصر ضرورت سے زیادہ داخل ہو گیا ہے۔ اس کے باوجود شبلی کی نثر جمالیاتی حس اور استدلالی علمیت کی مظہر ہے۔ ان کی نثر میں خاص طرح کا نظم وضبط اور توازن پایا جاتا ہے۔ پروفیسر قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی کے الفاظ میں: ''شبلی کے ذریعے اردو نثر میں مذہبی احوال و افکار کی تعبیر وتشریح سے مذہبی دانش وری کی روایت کی توسیع ہوئی اور شبلی مذہب کے راستے صحن ادب میں داخل

☆ اردو نثر کی تاریخ کے ضمن میں مضمون نگار نے صرف چند ہی شخصیات کا تذکرہ کیا ہے، بہت سی اہم شخصیات اور اداروں کے نام چھوٹ گئے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اردو کے فروغ میں مذہبی شخصیات اور علماء اور دینی اداروں کا غیر معمولی حصہ ہے۔ اس کا جائزہ لینے کے لیے الگ سے ایک مبسوط مقالہ کی ضرورت ہے۔ (معاون مدیر)

ہوئے''۔[۱۲] محمد حسین آزاد اور ڈپٹی نذیر احمد وہ اسلوب اختیار نہ کر سکے جو سماجی مقاصد کی تکمیل اور اعلیٰ مقاصد کا ترجمان ہوتا ہے، تاہم انھوں نے اردو زبان کو خالص علمی منہاج عطا کیا۔

اردو نثر کی اس مجموعی کلاسیکیت اور سادہ نویسی کے خلاف ردعمل کے طور پر اردو میں رومانویت کی تحریک شروع ہوئی اور بنے بنائے فکری سانچے اس کی زد میں آ گئے۔ رومانوی طرز کے ادیبوں نے اردو نثر میں لطافت و رنگینی پیدا کی۔ ابوالکلام آزاد نے اپنے انداز تحریر سے اردو نثر کو وہ شکوہ عطا کیا جس کی نظیر نہیں ملتی۔ انھوں نے علمی استدلال کی بجائے الفاظ کا جادو جگا کر قاری کو ہم نوا بنانے کی کوشش کی اور جذبات سے دلیل کا کام لیا۔ یہ درست ہے کہ اردو نثر میں مولانا آزاد کا اسلوب اپنی تازہ کاری کی وجہ سے ایک خاص درجہ رکھتا ہے، لیکن عربی و فارسی تراکیب سے مزین اسلوب تجزیاتی ہنر سے خالی ہے۔☆

اردو نثر کے اسالیب مولانا مودودی سے قبل

اگر ہم اردو نثر کے اسالیب کے حوالے سے اس عہد پر نظر ڈالیں تو مولانا مودودی سے پہلے اردو نثر میں بیسویں صدی کی دوسری دہائی تک اسالیب نثر میں چار واضح روایات نظر آتی ہیں۔ ایک روایت کا حامل وہ دینی ادب ہے جسے روایتی علما نے تیار کیا تھا۔ اس میں زبان کی صحت کا تو پورا اہتمام ملتا ہے، مگر اسلوب کے حسن کی زیادہ فکر نہیں کی جاتی تھی، بلکہ اصل اہمیت مواد اور معنی کو حاصل تھی۔ اس دینی ادب کا موضوع چوں کہ خالصتاً مذہبی مسائل تھے، اس لیے ان میں مذہبی اصطلاحات کا استعمال بہ کثرت ملتا ہے، جس کی وجہ سے یہ انداز تحریر خاصا مشکل اور بوجھل ہو گیا تھا۔ اردو نثر کی یہ روایت خالص مذہبی حلقوں میں ہی مقبول تھی، عوام الناس مشکل نثر کے سبب اس سے کم ہی استفادہ کر سکتے تھے۔ دوسری روایت کے بانی سرسید احمد خاں تھے۔ انھوں نے دینی ادب کی روایت سے ہٹ کر ایک نئی راہ نکالی اور اردو نثر کو اصلاحی تحریک کا ترجمان

بناتے ہوئے سادہ اور صاف ستھری نثر لکھی۔ انھوں نے مغربی ادب سے بھی استفادہ کیا اور خالص مذہبی امور کے ساتھ تہذیبی، معاشرتی، سیاسی اور علمی موضوعات پر بھی خامہ فرسائی کی۔ بہ قول ڈاکٹر سید عبداللہ: ''مذہبی تحریروں میں معقولات سے استفادہ کرنا اردو میں سرسید اور ان کے رفقا کی خصوصیت ہے۔ سرسید کی تحریر کا ایک بنیادی وصف ان کا منطقی اعتبار سے مربوط ہونا ہے''۔[۱۳] تحریک سرسید سے منسلک ہونے کے باوجود شبلی کی نثر کے اسلوب کی رنگینی، سنجیدگی، تمکنت اور رعنائی انھیں سرسید اور ان کے رفقا کے اسلوب سے ممتاز کرتی ہے۔ انھوں نے مذہبی نثر کی زیادہ حسین اور متوازن روایت قائم کی ہے۔ اردو نثر کو عربی اور فارسی ادب کے جان دار اجزا سے مالا مال کیا ہے، لیکن ان کا اسلوب کسی مشن کے لیے آدمی کو ابھارنے میں معاون نہیں ہوسکتا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے ان تینوں روایات سے ہٹ کر اردو نثر کو ایک نئے رنگ و آہنگ سے روشناس کیا۔ ان کی نثر کی بنیادی خصوصیت خطابت اور رومانویت ہے، لیکن جدید ذہن اس اسلوب سے مطمئن نہیں ہوسکتا تھا، اس لیے ان کی علمی و مذہبی نثری روایت ان کے ساتھ ہی ختم ہوگئی۔

ان چاروں روایات سے ایک بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ اردو ادب کی تاریخ میں جن ادیبوں نے اردو نثر کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا، یا اردو نثر کے دامن کو اسالیب، لہجوں اور الفاظ و تراکیب کے اعتبار سے وسعت دی وہ زیادہ تر وہی ادیب تھے جن کا موضوع مذہب تھا، یا جنھوں نے اجتماعی مقاصد کے لیے اردو نثر کو اظہار کا وسیلہ بنایا تھا۔

انیسویں اور بیسویں صدی کی دوسری دہائی تک اردو نثر کی یہ روایات مولانا مودودی کی نظر میں تھیں۔ انھوں نے ان چاروں روایات سے استفادہ کرتے ہوئے ان کے مثبت عناصر کو اپنے اسلوب میں جمع کیا اور پھر ایسا جان دار اسلوب تخلیق کیا، جس نے اردو نثر کے اسالیب میں پانچویں روایت کو پروان چڑھایا۔ یہ اسلوب، جسے مودودی اسلوب کہا جاسکتا ہے، مذہبی، علمی، فکری اور ادبی روایات کا خوب صورت امتزاج ہے۔

مولانا مودودی کے اسلوب کے ارتقائی ادوار

مولانا مودودی نے ۱۹۱۵ء کے لگ بھگ اپنی ادبی زندگی کا سفر شروع کیا۔ انھوں نے ابتدا میں مختلف تراجم کیے، لیکن صحافت سے ان کی قلمی زندگی کا باقاعدہ آغاز ہوا اور پھر یہ سلسلہ تادمِ آخر جاری رہا۔ اس دوران میں انھوں نے تاریخ نویسی کی، قرآن کریم کی سہل، سادہ اور علمی تفسیر پیش کی، سیرت نبوی پر خامہ فرسائی کی۔ ان کے علاوہ دیگر پہلوؤں پر بھی علمی انداز میں کام کیا۔ ان کے قلمی سفر میں ان کے اسلوب کے مجموعی رنگ کو ہم سلاست سے تعبیر کر سکتے ہیں، لیکن یہ اسلوب ارتقاء پذیر ہوتا رہا ہے۔ اس کے جائزے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان کی ابتدائی تحریروں میں سرسید، حالی، شبلی اور ابو الکلام آزاد کے اثرات موجود ہیں۔ ان میں سادگی، عربیت، جوش، خطابت، زورِ بیان اور تخیل کی کارفرمائی موجود ہے، لیکن منطقیت اور استدلال کا وصف بھی پایا جاتا ہے۔ سیرت النبی کے موضوع پر ۱۹۱۵ء میں انھوں نے جو مضمون لکھا تھا، وہ سادہ، آسان اور سہل تو ضرور ہے، لیکن اس میں بعض مشکل تراکیب اور عربی الفاظ نظر آتے ہیں، جیسے صحت اور تدقیق، عقیل وفہیم، شرک وتمرد، حقیقی مبحث، عقربیت، تغلیط وغیرہ، البتہ بحث کا تجزیاتی انداز اس تحریر میں بھی نظر آتا ہے۔ ایک جگہ لکھا ہے:

> ''اس کے معنیٰ یہ ہوئے کہ ۱۳ برس کی عمر میں حضرت اسماعیلؑ حضرت ہاجرہ کے کاندھے پر بیٹھے ہوئے نکالے گئے۔ اور یہ کسی طرح یقین نہیں کیا جاسکتا کہ تیرہ برس کا لڑکا اتنا چھوٹا ہو کہ ایک عورت اس کو اٹھا کر طویل سفر کرے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ توراۃ میں یہ واقعہ بالکل گھڑ کر لکھا گیا ہے''۔[۱۴]

مولانا مودودی نے اکتوبر ۱۹۱۸ء میں ایک مضمون **برق یا کھربا** کے عنوان سے لکھا تھا۔ اس مضمون کا موضوع خالصتاً سائنسی تھا، لیکن اوائل عمر میں سائنسی موضوع پر اردو نثر میں بہت خوب صورت انداز میں مضمون لکھ کر انھوں نے اپنے قادرالکلام ہونے کا ثبوت دیا۔ یہ مضمون بھی مشکل اسلوب کی مثال ہے۔ مشکل پسندی کا ایک سبب تو

موضوع کا تقاضا تھا، دوسرا سبب یہ تھا کہ اردو نثر میں مذہبی موضوعات پر لکھنے کے لیے الفاظ تو میسر تھے، لیکن خالصتاً سائنسی موضوعات پر لکھنا اس قدر آسان نہ تھا۔ مولانا نے اس مضمون میں مچھلیوں کے نام عربی زبان میں لکھتے ہوئے یہ معذوری ظاہر کی کہ ''افسوس اردو میں ان کے کوئی نام نہیں''۔ پروفیسر خورشید احمد لکھتے ہیں: ''اردو میں سائنسی عبارت کو ادا کرنے کی یہ روشن مثال ہے''۔[۱۵] اس مضمون میں بہت سی نئی تراکیب بھی وضع ہوئی ہیں، مثلاً: بندۂ بے دام، کامل کار، رفع ضرورت، اقتضائے قدرت الٰہی، کلید سفر بحری و بحری، تعجب و تحیر، جولان گاہِ تخیل۔

اسلوب کے ارتقائی سفر میں مشکل اسلوب کی ایک مثال ملاحظہ ہو:

''یورپ کے اختراعاتِ دماغیہ، جنھوں نے آج ایک عالم کو محوِ حیرت بنا دیا ہے، سائنس کی وہ ترقیاں جن کا کل کسی کو گمان تک نہ تھا، آج ہماری سامعہ ان سے متحیر اور ہماری باصرہ ان سے متعجب ہے''۔[۱۶]

۱۹۲۰ء کی ایک تحریر کا آغاز جن الفاظ سے ہوتا ہے ان کے پس منظر میں شبلی کی رنگینیِ خیال اور ابوالکلام آزاد کی خطابت و رومانویت صاف نظر آتی ہے۔ جوش و جذبہ، ولولہ اور بلند آہنگی کا یہ رنگ مولانا کی صرف ابتدائی تحریروں میں ہی پایا جاتا ہے:

''آہ، میں کیوں کر خون شدہ دل کو سمجھا لوں کہ وہ تو کسی مسلمان کو اتنا بے حمیت ماننے کے لیے تیار نہیں۔ میری تمھاری شناسائی تو ایثار و قربانی کے صدیق اور فاروق نے کرائی تھی۔ میں نے تم سے صرف آٹھ لاکھ روپیا مانگا ہے، اگر تم چاہو تو یہ رقم ایک ہفتے میں جمع کر کے وہاں بھیج سکتے ہو''۔[۱۷]

مولانا مودودی نے مصطفیٰ کامل پاشا کی زندگی پر جو مضمون لکھا اس کے بیش تر جملوں میں ابو الکلام آزاد کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ وہی طنطنہ، جوش، خطابت، رومانویت، مشکل پسندی اور استعاراتی رنگ ہے۔ ایک نمونہ ملاحظہ کیجیے:

''آج ۶۱ برس کی پر انقلاب مدت گزر جانے کے بعد بھی جب آل فراعنہ کے سامنے یہ نام [مصطفیٰ کامل پاشا] لیا جاتا ہے تو وہ وجد میں آ جاتے ہیں۔ ان کی

آنکھوں میں وہ زمانہ پھر جاتا ہے جب اس نام کے ایک دبلے پتلے، ضعیف الجثہ نوجوان نے اوّل اوّل انھیں ہوش کی دوائی سنگھائی تھی، جھنجھوڑ کر بیدار کیا تھا اور طلب واستقلال کی ایسی تند و تیز شراب پلادی تھی جس کا نشہ سخت سے سخت ترشیوں کے باوجود آج تک برابر بڑھتا ہی جارہا ہے۔ وہ شخص دراصل مصر کا اوّلین داعی حریت تھا''۔ [۱۸]

سید ابو الخیر کشفی کے الفاظ میں: ''مصطفیٰ کامل پاشا کے سوانح پر مودودی صاحب کے طویل مقالے کے کتنے فقروں اور جملوں پر مولانا آزاد کے اسلوب کی چھاپ موجود ہے''۔ [۱۹]

مولانا مودودی کے ابتدائی اسلوب میں شبلی اور ابو الکلام آزاد کے اسلوب کی چھاپ کا بڑا سبب یہ ہے کہ انھوں نے بچپن میں تاریخ کے موضوع پر شبلی کی لکھی ہوئی کتابوں اور الہلال کو تواتر کے ساتھ پڑھا تھا۔ وہ ان کے اسلوب سے متاثر بھی ہوئے تھے، اس لیے ان کے ابتدائی اسلوب میں ''دو زیریں لہریں ہمیں متوجہ کرتی ہیں اور یہ دونوں لہریں ایک دوسرے سے نبرد آزما نظر آتی ہیں: ایک شبلی کا اسلوب، دوسری ابوالکلام کا اندازِ نگارش''۔ [۲۰]

۱۹۱۷ء کے بعد ابتدائی تین چار برسوں میں مولانا مودودی کو جس کا انداز تحریر پسند آتا، غالباً وہ اس کی نقل کی کوشش کرتے، لیکن مطالعہ میں اضافہ کے ساتھ انھوں نے محسوس کیا کہ تحریر کی اصل خوبی دوسروں کے انداز میں لکھنا نہیں، بلکہ اپنا مستقل انداز تحریر اختیار کرنا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر ادیب کے ابتدائی اسلوب میں دوسروں کے اسلوب کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں اور یہ کوئی خامی نہیں، کیوں کہ ممتاز حسین کے خیال میں: ''ذہنی تخلیق انفرادی اسلوب کو جنم تو ضرور دیتی ہے، لیکن اس کا قطعی مطلب نہیں کہ اس انفرادیت میں ہم عصر فن کاروں کی تخلیقات کی کوئی مشترکہ قدر موجود نہ ہو''۔ [۲۱]

مولانا مودودی کی وہ تحریریں، جو ۱۹۲۴ء سے ۱۹۲۸ء تک لکھی گئی ہیں، ہنگامیت اور صحافت کے تقاضوں کے باوجود اپنے اندر سلاست، استدلال، دل کشی، شگفتگی اور

رعنائی کی خوبیاں رکھتی ہیں۔ اس دور کی تحریروں میں سادگی و پرکاری ہے۔ ۱۹۲۴ء کے بعد ان کے ہاں سادگی، سلاست اور روانی ایک مستقل اسلوب فن کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ ان کے اسلوب میں ارتقا کی جو صورت نظر آتی ہے اس میں یہ بات سب سے نمایاں ہے کہ انھوں نے شعوری طور پر اپنی تحریروں کو سادہ، سلیس، رواں، دلچسپ، عام فہم اور دل نشیں بنانے کی کوشش کی ہے۔ اسلوب میں شعوری طور پر سادگی کی طرف مراجعت کے سلسلے میں پروفیسر فروغ احمد لکھتے ہیں:

''اغلب تھا کہ سید مودودی بھی نثرِ ابو الکلام آزاد کی روش پر چل نکلتے، لیکن انھوں نے اپنے بے پایاں جذبۂ اظہار کے باوجود خطابت کی تند و تیز روش اختیار کرنے کی بجائے سنگ ریزوں کو سڈول بنانے اور آبادیوں کو سیراب کرنے والے نرم رو دریا کے بہاؤ کو اپنے لیے پسند کیا''۔[۲۲]

مولانا مودودی کی ابتدائی تحریروں کے اسلوبیاتی مطالعے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ان کے تراجم میں بھی ترجمے کی اصل روح کارفرما نظر آتی ہے۔ وہ تاریخ لکھتے ہیں تو اس میں دل کشی پیدا کر دیتے ہیں، صحافت علمیت کے ساتھ مل کر ان کے ہاں نئے علمی اسلوب کو اجاگر کرتی ہے۔ خطوط موضوعاتی تنوع اور اسلوب کی جاذبیت لیے ہوئے ہیں اور تبصرے محض عبارات آرائی کے ذیل میں نہیں آتے، بلکہ قاری پر کتاب کی اصلی معنویت عیاں کرتے ہیں۔ وہ موزوں ترین خیال کے لیے بہترین لفظ ہی استعمال کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

''میں اس نظریے کا قائل ہوں کہ ہر خیال اپنے ساتھ خود الفاظ لاتا ہے اور ہر خیال کو ادا کرنے کے لیے سب سے موزوں الفاظ وہی ہیں جو اس خیال کے ساتھ خود بہ خود چلے آتے ہیں، لہٰذا ہمیں صرف مضمون سوچنا چاہیے''[۲۳]

مولانا مودودی کے خیالات میں تنوع ہے، اس لیے ان کے اسلوب میں بھی بہت وسعت ہے۔ وہ مولوی نذیر احمد، حالی، شبلی یا ابوالکلام آزاد کی طرح ہر موضوع کے لیے ایک ہی اسلوب اختیار نہیں کرتے، بلکہ ہر موضوع کے حسب حال انداز تحریر اپناتے

ہیں۔ان کے ہاں دو اسالیب بہت واضح طور پر جدا جدا پائے جاتے ہیں۔ایک ان کی جوانی کا دور ہے، جس میں روانی اور زورِ بیان اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔ اس میں بھی اگرچہ استدلال اور سنجیدگی تو ہے، مگر شعلے کی سی لپک اور طوفان کا سا دبدبہ بھی ہے، جب کہ دوسرے دور میں اعتماد اور ٹھہراؤ کی فضا ملتی ہے''۔[۲۴]

الجہاد فی الاسلام پہلے دور کی کتاب ہے۔اس دور میں مولانا مودودی کے ہاں ڈاکٹر عبدالمغنی کے الفاظ میں ''الفاظ کی سادگی، بیان کی روانی، نکات کی برجستگی، بحث کی منطقیت، تجزیاتی انداز اور ترتیبِ اظہار نمایاں ہے''۔[۲۵] اس کتاب میں ان کے اسلوب کی جملہ خوبیاں اس انداز میں سامنے آتی ہیں کہ پڑھنے والا تحریر کی صداقت، وضاحت، قطعیت اور استدلال سے نہ صرف متاثر ہوتا ہے، بلکہ شکوک وشبہات کی دنیا سے گزر کر یقین اور صداقت کے جہاں میں داخل ہو جاتا ہے۔ان کا مقصد اس عہد کے مروّجہ افکار کی تنقیح کر کے مسلمانوں کے اندر اعتماد پیدا کرنا اور اسلام کی حقانیت ثابت کرنا تھا۔اس لیے اس دور میں اُن کے اسلوب میں منطقی انداز، نکتہ آفرینی، سلاست، روانی، طرزِ اظہار میں تاثیر، جدت کے ساتھ ادبی پختگی، محاورات کی چستی، مزاح کی چاشنی اور ابلاغ کی رعنائی ملتی ہے۔ان کی عام فہم تصانیف دینیات اور خطبات اسی دور سے تعلق رکھتی ہیں اور اسی زمانے میں سود اور پردہ بھی تصنیف کی گئی تھیں۔یہ مولانا مودودی کا کمال ہے کہ وہ اپنے مخاطب، موضوع اور مواد کی ترتیب سے ایسا بے ساختہ، برجستہ اور ادبی خوبیوں سے مزین اسلوب تشکیل دیتے ہیں کہ قاری موضوع اور اسلوب دونوں کا بیک وقت لطف لیتا ہے۔

مولانا مودودی کے اسلوب کا تیسرا دور تیس سال کے طویل دورانیے پر مشتمل ہے۔اس میں وہ ایک صاحب طرز ادیب کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ان کے اسلوب کا کلاسیکی پہلو نمایاں ہونے لگتا ہے۔ سادگی و پرکاری، ادبی نفاست، استدلال، اعتماد، اعتدال، قطعیت، حرکیت، فعالیت، جامعیت، فصاحت، بلاغت، علمیت، ایجاز، اطناب، ذکاوت، شگفتگی، طنز اور اس طرح کے دیگر ادبی محاسن اردو اسلوب کی نئی روایت کو جنم

دیتے ہیں۔ ایک طرف تو سہل ممتنع کی نثری روایت ارتقائی شکل میں ڈھلتی ہے تو دوسری طرف اپنے اندر ادبی محاسن بھی رکھتی ہے۔ اس آخری دور میں مولانا مودودی کے اسلوب کی یہ روایت اپنے کمال پر نظر آتی ہے۔ مڈلٹن مرے نے جو یہ کہا تھا کہ ''بہترین اسلوب وہی ہے جس میں صاحب قلم مضمون کی معنویت میں اتنا سرشار ہو کر لکھے کہ اسے خیال بھی نہ آئے کہ وہ کوئی اسلوب تخلیق کر رہا ہے''[۲۶] اس رائے کا حقیقی معنوں میں اطلاق مولانا مودودی کی ادبی شخصیت پر ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ان کے پیش نظر نہ تو عبارت آرائی تھی، نہ قصہ گوئی، نہ انانیت سے مرعوب کرنے کی تمنا، وہ تو مضمون کی معنویت میں ڈوب کر ایسا اسلوب تخلیق کر رہے تھے جو ان کے پیش رو قلم کاروں کے اسلوب کی ارتقائی بلکہ مکمل شکل تھا۔ اس میں سرسید کے اسلوبِ بیان کی وضاحت وصراحت، حالی کے اندازِ بیان کی سادگی و بے ساختگی، نذیر احمد کی برجستگی، آزاد کی شگفتگی، شبلی کی ہمواری اور ابوالکلام کی طرفگی و رعنائی کے ساتھ پُر اثر نثر کے تمام اجزا موجود ہیں۔[۲۷]

مولانا مودودی نے مکمل اور زندہ اسلوبِ نثر تخلیق کیا ہے، جو روایت سے بھی جڑا ہوا ہے اور اپنی انفرادی شان بھی رکھتا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے لکھا ہے:

> ''مولانا کی نثر اپنا ایک خاص انفرادی رنگ رکھتی ہے۔ مشکل مسائل کو سیدھے سادے انداز میں پیش کرنے کا جو ڈھنگ انھیں آتا ہے، اس سے ان کی نثر ایک عام قاری کو اپنی طرف اسی شدت سے کھینچتی ہے جس شدت سے ایک عالم کو۔ انھوں نے ہماری اردو نثر کی روایت میں یہ انقلابی تبدیلی پیدا کی ہے کہ اسے دینی نثر کے عام اسلوب سے الگ کر کے عام پڑھنے والوں کے لیے یک گونہ سہولت پیدا کر دی ہے۔ اردو ادب میں دینی سرمایے کو بیان کرنے کے لیے جو عربی آمیز ڈھنگ اختیار کیا گیا، اس میں ایک خاص طرح کا مولویانہ رنگ نمایاں رہا ہے، لیکن مولانا کی نثر میں ایک ادبی شان پائی جاتی ہے۔ وہ بلاشبہ اردو کے صاحب طرز نثر نگار تھے''۔[۲۸]

مولانا مودودی کے اسلوب کی نمایاں خصوصیات

مولانا مودودی نے اردو نثر کے اسالیب کے مختلف اجزا کو جذب کر کے ایک نیا اسلوب تشکیل دیا ہے، جس میں اردو نثر کی دینی، علمی، فکری، ادبی اور دانش وارانہ روایت کے سارے رنگ جمع ہو کر 'اسلوب مودودی' میں ڈھل گئے ہیں۔ اس کی نمایاں خصوصیات درج ذیل ہیں:

۱- مقصدیت

مولانا مودودی کے اسلوب کی سب سے اہم خوبی مقصدیت ہے۔ یہ عنصر بے حد اہم اس لیے ہے، کیوں کہ مقصد بدل جانے سے اسلوب بھی بدل جاتا ہے۔ دنیا کا عظیم ادب کسی مقصد کے تحت ہی وجود میں آیا ہے اور مولانا مودودی، جن کے نزدیک ادب دماغوں کو ڈھالنے والی قوت ہے، ان کے ہاں اسلوب میں مقصدیت لازمی تھی۔ ان کی تحریر میں مقصدیت جب ربط و تنظیم، منطقی ترتیب، اور سلاست و سادگی کے ساتھ سامنے آتی ہے تو قاری کے سامنے بھی وژن بالکل نمایاں ہو جاتا ہے اور وہ بھی زندگی کے محدود تصور اور دائرے سے باہر نکل کر راہ عمل پر گام زن ہونے کے لیے آمادہ نظر آتا ہے۔ پھر وہ زندگی کو ٹکڑوں میں بٹا ہوا نہیں دیکھتا، نہ کوئی جزوی اصلاح یا ترمیم اسے مطمئن کر سکتی ہے۔ ڈاکٹر سید عبدالباری لکھتے ہیں:

> ''سرسید کے مقابلے میں سید مودودی کی فکر زیادہ توانا اور مربوط تھی، جس نے ایک طاقت ور ڈائنا مائیٹ کی طرح مادیت، الحاد پرستی پر مبنی نظریات اور فلسفے کی چٹانیں ریزہ ریزہ کر دیں۔ اسی مربوط فکر نے انھیں توانا اور مقصدی اسلوب عطا کیا''۔ [۲۹]

۲- اعتماد اور قطعیت

زندگی کے بارے میں مولانا مودودی کے واضح نصب العین نے ان کے ہاں جہاں فکری نظم و ضبط پیدا کیا ہے وہیں ان کی تحریر میں اعتماد، قطعیت اور تیقن کی خصوصیات

بھی پیدا کی ہیں۔ ان کے اسلوب کی قطعیت قرآن کے وسیع مطالعے، غور وفکر اور تدبر کی عادت، نیز اپنے نصب العین پر کامل یقین کی بدولت ہے۔ ان کی تحریریں تشکیک، مایوسی، فکری انتشار اور گومگو کی کیفیت سے بالکل پاک ہیں۔ ان کی شخصیت کا اعتماد، تیقن اور فکری پختگی ان کے اسلوب میں بڑی رعنائی اور دل کشی کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ کیٹس نے کہا تھا:

''اسلوب کی صراحت اور طرز ادا کی قطعیت ہی ادیب کی کامیابی کا سب سے بڑا راز ہے''۔[۳۰]

مولانا مودودی کے خیالات میں کہیں ابہام نہیں ہے۔ وہ جو بات کہتے ہیں پورے اعتماد اور یقین کے ساتھ کہتے ہیں۔ ان کے یہاں 'یہ بھی اور وہ بھی' کا رنگ نہیں پایا جاتا۔ اس لیے ہم ان کی کسی بات سے کوئی دوسرا مفہوم اخذ نہیں کر سکتے۔ وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں بالکل واضح اور روشن ہوتا ہے۔ پیچیدگی یا الجھاؤ اسلوب میں صرف اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب مقصد ہی میں الجھاؤ یا پیچیدگی ہو، لیکن جب خیال واضح اور قطعی ہو تو اسلوب میں قطعیت پیدا ہوتی ہے''۔[۳۱] مولانا مودودی کے ہاں لہجے کا جو اعتماد اور استحکام ہے وہ محض اس لیے ہے کہ انھوں نے جو بات بھی کی وہ اتنی مضبوط بنیادوں پر کی ہے جیسے یہی قطعی اور آخری ہو۔ آل احمد سرور نے بڑی خوب صورت بات کی ہے:

''ابہام یا اشکال الفاظ سے کم اور خیال سے زیادہ پیدا ہوتا ہے''۔[۳۲] ڈاکٹر عطش درانی نے مولانا مودودی کے اسلوب کے بارے میں لکھا ہے:

''سید مودودی کی نثر کی سب سے بڑی خوبی اس کی قطعیت اور وضاحت ہے''۔[۳۳]

۳- استدلال

مولانا مودودی کی نثر زبردست قوتِ استدلال کی حامل ہے۔ اس کا مجموعی تاثر سلاست اور استدلال ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ انھوں نے زندگی کو ایک کل کی حیثیت میں دیکھا ہے۔ وہ برعظیم کے مسلم معاشرے کے تمام رویوں، مزاجوں اور رجحانات کے مقابل ایک نئی فکر، نیا انداز اور نیا نقشہ لے کر آئے تھے۔ انھوں نے لکھنا شروع کیا تو

پوری دنیا پر مغرب کی علمیت اور سائنس کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی، فلسفہ وعقل کی تمام شعبہ ہائے زندگی پر حکم رانی تھی اور نئی نسل اس سے مرعوب ہو چکی تھی۔ وہ مغربی فلسفے اور سائنس کے مطالعے کے سبب استدلالی نثر کی قائل تھی اور ہر بات دلیل کے ساتھ سننا، سمجھنا اور قبول کرنا چاہتی تھی۔ مولانا مودودی سے قبل سرسید، حالی، شبلی اور ابوالکلام کے ہاں بھی استدلالی اسلوب موجود ہے، لیکن: ''شبلی کے ہاں منطقیانہ رنگ نے مناظرہ، ہیجان اور جوش وخروش کی شکل اختیار کر لی ہے۔ ابوالکلام کے ہاں یہ فلسفیانہ صورت میں ملتی ہے، جب کہ سرسید کے ہاں کرختگی ہے، ان کا منطقی استدلال انتہائی سخت ہوتا ہے۔ سید مودودی کے ہاں منطق، ادق مسائل کا سلسلہ جواب در جواب نہیں، بلکہ عام فہم اور سادہ ہے، اس لیے ان کی تحریروں میں ہیجانی اور بحرانی کیفیت نہیں'' [۳۴]

منطقی طرز استدلال میں بات دلائل سے کی جاتی ہے۔ سید مودودی کی تحریر میں دلائل اور منطقیت کی گرفت مضبوط ہے۔ یہ نہ شاعرانہ ہے نہ مناظرانہ، اس لیے کہ ان کے ذہنی تموّجات ان کے استدلال کے تابع ہیں اور خیال دھیمے پن کی خوبی سے آراستہ ہوتا ہے۔ مرزا ادیب کے الفاظ میں: ''انھوں نے کسی دقیق مسئلے کی وضاحت کرتے ہوئے ادبی لطافتوں کو قربان نہیں کیا۔ ان کے ہاں دلائل کی منطقیت اور ادب کی چاشنی دونوں چیزیں اس انداز سے ہم آہنگ ہوتی ہیں کہ امتیاز کرنا مشکل ہے''۔ [۳۵]

۴- اعتدال

مولانا مودودی اعتدال اسلوب کے لیے اپنے جذبات پر بند باندھ دیتے ہیں۔ جذبات نگاری کے لیے وہ زبان کے چٹخارے کی طرف بھی متوجہ نہیں ہوتے۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی لکھتے ہیں: ''مولانا مودودی اردو کے بہترین انشا پردازوں میں سے ہیں۔ وہ نہایت خوب صورت، دل کش اور دل نشین اسلوب رکھتے ہیں، جو ان کی شخصیت ہی کی طرح فکر وخیال اور حسن ادا کے توازن واعتدال کا نمونہ ہے۔ موضوع کیسا ہی نازک ہو وہ کبھی جذباتیت کو راہ نہیں دیتے'' [۳۶] ان کے خیالات اور الفاظ میں بھی

ایک تناسب پایا جاتا ہے۔ وہ مواد اور اسلوب دونوں کو یکساں اہمیت دیتے ہیں۔ یہ ان کی اسی معتدل سوچ کا نتیجہ ہے کہ ان جیسے کثیر المطالعہ شخص کی تحریروں میں جتنی اہمیت مواد کو ہے اتنی ہی اسلوب کو حاصل ہے۔ اِسی خوبی نے ان کے اسلوب میں رنگارنگی، تنوع، اخلاص اور بے ساختگی کی خصوصیات پیدا کر دی ہیں۔

مولانا نے علمی مضامین کے لیے بھی سادہ اور عام فہم زبان استعمال کی، لیکن ان کی سادگی محض سادگی نہیں، بلکہ انھوں نے معناً پرشکوہ اور لفظاً سلیس و سادہ طرز بیان اختیار کیا۔ انھوں نے بھاری بھرکم مطالب بیان کیے، مگر انھیں بالکل عام فہم بنا دیا۔ ان کی پرورش دادہ زبان 'اردوئے مبین' ہے''۔ [۳۷]

مولانا مودودی کے اسلوب کی سادگی ادبیت اور علمیت کے ساتھ مل کر نثر کا ایسا عمدہ نمونہ تخلیق کرتی ہے جس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ قدرت اللہ شہاب لکھتے ہیں:

''عموماً اہل علم جب کسی موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں تو ان کی تحریریں بھاری بھرکم الفاظ وتراکیب اور ادق اصطلاحات وتشبیہات کے باعث عام ادراک وفہم سے بالاتر ہو جاتی ہیں، یا پھر ادبیت کی چاشنی ان میں اتنی شامل ہو جاتی ہے کہ موضوع کی لطافت اس سے متاثر ہوتی ہے۔ اس کے برعکس مولانا کی تحریر میں یہ خوبی ہے کہ وہ خالص علمی وفکری موضوعات پر بھی جب قلم اٹھاتے ہیں تو ان کا وہ مخصوص انداز قائم رہتا ہے جس سے اہل علم بھی استفادہ کر سکتے ہیں اور عام پڑھا لکھا آدمی بھی''۔ [۳۸]

مولانا مودودی کا اسلوب قاری کے دل و دماغ میں ایک مسرت، ایک بصیرت، ایک شادمانی، ایک انبساط، ایک طمانیت، ایک لطافت اور ایک روشنی پیدا کر دیتا ہے۔ اسلوب کی یہ روشنی دل و دماغ میں جوش، ولولہ اور تحرک پیدا کر کے جذبۂ عمل پر ابھارتی ہے۔ ان کا اسلوب اپنے اندر بہت سے پہلوؤں سے انفرادیت رکھتا ہے۔ اس میں استدلال، قطعیت، مقصدیت، متانت، سنجیدگی، اعتدال، سلاست، شگفتگی، تازگی، ندرت اور ادیبانہ شان موجود ہے۔ موضوعات اور اسلوب میں تنوع نے ان کے ہاں رنگارنگی کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ ادبی محاسن اپنی بہار دکھاتے ہیں تو یہ اسلوب آفاقیت

اور عالمگیریت میں ڈھل جاتا ہے۔موضوع اور اسلوب میں خوب صورت ربط نے ان کی تحریروں کو جذبہ، حسن اور رعنائی عطا کی ہے۔ان کے ہاں الفاظ نگینوں کی طرح جڑے نظر آتے ہیں، جس سے موضوع کو بھی تابندگی ملتی ہے اور اسلوب کو بھی اعتبار حاصل ہوتا ہے۔ اسی لیے ماہرالقادری نے کہا ہے: ''اردو زبان میں مولانا کی تحریروں پر ادب عالیہ کا اطلاق ہوتا ہے۔فکر بھی بلند اور اسلوبِ اظہار بھی حسین''۔۳۹

مولانا مودودی کے اسلوب میں حقیقت نگاری، تنوع، شگفتگی، مزاح، طنز، شوخی اور جزئیات نگاری جیسی خوبیاں شامل ہیں۔اس کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے قارئین کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔اس نے بلا مبالغہ لاکھوں انسانوں کی سوچ، فکر اور شخصیت کو متاثر کیا ہے اور انھیں بدل کر رکھ دیا ہے۔زندہ، جان دار اور آفاقی اسلوب کی یہی پہچان ہے۔

حواشی و مراجع

۱۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، اوراق، لاہور، بہار نمبر، اپریل مئی ۱۹۸۲ء، ص ۱۹۶

۲۔ اشارات تنقید، سنگ میل پبلیکیشنز لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۲۵۶

۳۔ بہ حوالہ ڈاکٹر جمیل جالبی، اوراق، لاہور، ص ۱۹۷

۴۔ اردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا حصہ، انجمن ترقی اردو کراچی، ص ۱۶

۵۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، تاریخ ادب اردو-۱، مجلس ترقی ادب لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۹۰۰

۶۔ پروفیسر آسی ضیائی، سیارہ لاہور، جنوری، ۱۹۸۹ء، ص ۵۰

۷۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، سرسید احمد خاں اور ان کے نام ور رفقا کی اردو نثر کا فنی و فکری جائزہ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۶ء، ص ۴۸

۸۔ مقدمہ تقویۃ الایمان، اہل حدیث اکادمی لاہور، ۱۹۷۱ء، ص ۱۸

۹۔ سیارہ لاہور، جنوری، ۱۹۸۹ء، ص ۵۳

۱۰۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ، اردو نثر کا آغاز و ارتقا، کریم سنز کراچی، ۱۹۷۸ء، ص ۳۹۳-۳۹۴

۱۱۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، سرسید اور ان کے نام ور رفقا، ص ۴

۱۲ شبلی کی علمی وادبی خدمات، انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی، ۱۹۸۶ء، ص ۱۳۲-۱۳۳

۱۳ ڈاکٹر سید عبداللہ، سرسید اور ان کے نام ور رفقا، ص ۵۳-۵۴

۱۴ وثائق مودودی، ادارہ معارف اسلامی لاہور، ۱۹۸۴ء، ص ۱۹

۱۵ سید مودودی اور ماہ نامہ معارف، ادارالمعارف واہ کینٹ، ۱۹۹۸ء، ص ۱۲

۱۶ ایضاً، ص ۸۹

۱۷ ہفت روزہ آئین لاہور، ۲۵/اگست ۱۹۸۳ء، ص ۳۱-۳۲

۱۸ المسئلۃ الشرقیہ، ادارہ معارف اسلامی لاہور، ۱۹۹۳ء، ص ۱۷

۱۹ مولانا مودودی کی ادبی حیثیت، مشمولہ ادبیات مودودی، ص ۱۷۶

۲۰ پروفیسر خورشید احمد، ترجمان القرآن لاہور، مئی ۲۰۰۴ء، ص ۱۹۸

۲۱ ادبی مسائل، مکتبہ اردو لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۱۳۷

۲۲ سیاہ لاہور، ستمبر ۱۹۹۵ء، ص ۱۶۴

۲۳ تصریحات، البدر پبلیکیشنز لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۵۵

۲۴ پروفیسر آسی ضیائی، ترجمان القرآن لاہور، ستمبر ۲۰۰۰ء، ص ۳۳-۳۴

۲۵ ڈاکٹر عبدالمغنی، مولانا مودودی کی ادبی خدمات، فاران نشریات لاہور، ۱۹۹۲ء، ص ۲۱

۲۶ ڈاکٹر محمد حسن رضا، مولانا مودودی کا اسلوب ایک مطالعہ، سیارہ، مارچ-اپریل ۱۹۹۷ء، ص ۱۲۳

۲۷ ڈاکٹر عبدالمغنی، ص ۵۴

۲۸ سیارہ، اپریل-مئی ۱۹۸۰ء، ص ۶۲

۲۹ سیارہ، مئی-جون، ۱۹۸۵ء، ص ۴۶

۳۰ سید شفیق احمد، معیار، میرٹھ، جولائی ۱۹۵۵ء، ص ۱۷

۳۱ پروفیسر افتخار حسین شاہ، اردو نثر نگاری کا دور بہ دور جائزہ، تحقیق مقالہ برائے پی ایچ ڈی، شعبہ اردو پنجاب یونیورسٹی، لاہور (غیر مطبوعہ)، ۱۹۶۳ء، ص ۲۶

۳۲ آل احمد سرور، مجموعہ تنقیدات، ص ۵۷۴

۳۳ ڈاکٹر عطش درانی، اصناف اردو کی مختصر تاریخ، مکتبہ میری لائبریری لاہور، ۱۹۸۲ء، ص ۹۷

۳۴ اعظم رضوی، سیاہ، مارچ ۱۹۸۳ء، ص ۱۲۳
۳۵ سیارہ، مئی ۱۹۸۰ء، ص ۱۵۴
۳۶ سیارہ، مئی ۱۹۸۸ء، ص ۶۶
۳۷ نعیم صدیقی، المودودی، الفیصل لاہور، ۱۹۹۸ء، ص ۲۳۸
۳۸ سیارہ، سالنامہ، ۱۹۸۷ء، ص ۱۵۶
۳۹ ماہر القادری، ادبیات مودودی، ص ۱۴۴

اعلانِ ملکیت سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی، فارم: ۴، رول: ۹

۱۔ مقام اشاعت: پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ
۲۔ نوعیت اشاعت: سہ ماہی
۳۔ پرنٹر پبلشر: سید جلال الدین عمری
۴۔ قومیت: ہندوستانی
پتہ: دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی - ۲۵
۵۔ ایڈیٹر: سید جلال الدین عمری،
پتہ: دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی - ۲۵
۶۔ ملکیت: ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی،
پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ

بنیادی ارکان کے اسمائے گرامی

۱۔ مولانا سید جلال الدین عمری (صدر)
دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی - ۲۵
۲- پروفیسر صدیق حسن (نائب صدر)
دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی - ۲۵
۳- ڈاکٹر صفدر سلطان اصلاحی (سکریٹری)
سی ۹، ڈوپلکس کوارٹرس، سول لائنس، علی گڑھ
۴۔ ڈاکٹر محمد رفعت (خازن)
شعبۂ فزکس، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی
۵۔ ڈاکٹر محمد عبدالحق انصاری (رکن)
دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی - ۲۵
۶۔ مولانا محمد فاروق خاں (رکن)
۱۳۵۳ - باز ارچتلی قبر، دہلی - ۶
۷۔ جناب ٹی، کے، عبداللہ (رکن)
مالاتھن کنڈی ہاؤس، یلیری، کالی کٹ
۸۔ ڈاکٹر احمد سجاد (رکن)
طارق منزل، بریاتو ہاؤسنگ کالونی، رانچی
۹۔ جناب محمد جعفر (رکن)
دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی - ۲۵
۱۰۔ جناب نصرت علی (رکن)
دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی - ۲۵
۱۱۔ انجینیر سید سعادت اللہ حسینی (رکن)
حیدرآباد

مندرجہ بالا معلومات میرے علم و یقین کی حد تک بالکل درست ہیں۔

پبلشر
سید جلال الدین عمری

ترجمہ وتلخیص

علامہ مجدالدین فیروزآبادیؒ بہ حیثیت مفسّر

تحریر: ڈاکٹر محمد احمد الکردی
ترجمہ وتلخیص: مولانا محمد جرجیس کریمی

سوانح حیات

علامہ مجدالدین فیروزآبادی صاحب القاموس المحیط کی شہرت علمی حلقوں میں ایک ماہر لغت کی حیثیت سے ہے، لیکن ان کی علمی خدمات کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے اور وہ یہ کہ وہ ایک مفسّر بھی تھے۔ تفسیر سے متعلق ان کی متعدد تصانیف ہیں۔ زیر نظر مقالے میں اسی حیثیت سے ان کے علمی کام کا تعارف کرایا جارہا ہے۔

نام اور لقب

بعض تذکرہ نگاروں نے آپ کا نام مختصراً اس طرح بیان کیا ہے: ''محمد بن یعقوب بن محمد مجدالدین ابوطاہر الفیروزآبادی اللغوی الشافعی'' [۱]۔ بعض تذکرہ نگاروں نے پورا سلسلۂ نسب بیان کیا ہے، جو یہ ہے: محمد بن یعقوب بن محمد بن ابراہیم بن عمر بن ابی بکر بن أحمد بن محمود بن ادریس بن فضل اللہ بن الشیخ ابی اسحاق ابراہیم بن علی بن یوسف بن عبداللہ المجد ابوطاہر وابوعبداللہ بن السراج ابی یوسف بن الصدر ابی اسحاق بن الحسام السراج الفیروزآبادی الشیرازی اللغوی الشافعی'' [۲]۔

علامہ موصوف کی متعدد نسبتیں بیان کی گئی ہیں: الکازرینی، الفیروزآبادی، الشیرازی۔ اول الذکر آپ کی جائے پیدائش ہے، ثانی الذکر آپ کا شہر ہے اور شیراز آپ کے ملک کا دارالحکومت تھا [۳]۔ آپ کے بعض القاب بھی بیان کیے گئے ہیں جیسے القاضی، الشافعی، اللغوی، الملتجی الی الحرم، القرشی، التمیمی۔ قاضی کہے جانے کی وجہ یہ ہے

کہ آپ یمن کے منصب قضا پر فائز تھے۔لغوی آپ کو اس وجہ سے کہا گیا کہ فن لغت پر آپ کی متعدد تصانیف ہیں اور اسی حیثیت سے آپ کو شہرت ملی۔ ملتجیٰ الی الحرم سے مراد یہ ہے کہ آپ خانۂ کعبہ کو لازم پکڑے ہوئے تھے اور مکہ اور حرم سے باہر کہیں جانا پسند نہیں کرتے تھے۔ آپ نے وصیت کی تھی کہ وفات کے بعد ان کی تدفین مکہ ہی میں کی جائے۔ شافعی کہے جانے کی وجہ یہ ہے کہ آپ شافعی مسلک کے پیرو تھے۔ تمیمی کی نسبت علامہ عبدالوہاب السبکسکی کے علاوہ کسی نے نہیں بیان کی ہے۔[۴]

ولادت اور وفات

فیروز آبادی کی ولادت ۷۲۹ھ مطابق ۱۳۲۷ء کو کازرون یا کازرین میں (یہ دونوں دو شہروں کے نام ہیں، جو قریب قریب واقع ہیں)[۵] اور وفات ۸۱۷ھ میں زبید (یمن) میں ہوئی۔ آپ کی تمنا تھی کہ آپ کی وفات مکہ مکرمہ میں ہو اور وہیں آپ کو سپرد خاک کیا جائے، مگر اللہ تعالیٰ کی مشیت کچھ اور تھی، چنانچہ آپ کا انتقال یمن میں ہوا اور وہیں شیخ الجبرتی کے قبرستان میں مدفون ہوئے۔[۶] یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وفات کے بعد آپ کو مکہ مکرمہ منتقل کیا گیا تھا۔[۷]

تعلیم وتربیت اور علمی اسفار

علامہ فیروز آبادی نے اولین مرحلہ میں قرآن مجید حفظ کرلیا تھا، اس کے بعد مختلف علوم وفنون کی تحصیل کی، جن میں لغت، صرف ونحو اور قرآن وحدیث کے علوم شامل ہیں۔[۹] ابتدائی تعلیم ان کے والد ماجد کی نگرانی میں کازرین میں ہوئی، پھر مزید تحصیل علم کے لیے شیراز گئے، اس کے بعد مختلف ملکوں کا سفر کیا، جن میں عراق، دمشق، بیت المقدس، مصر، مکہ مکرمہ اور یمن خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ علامہ موصوف نے عراق میں دس سال (۷۴۵ھ تا ۷۵۵ھ) قیام کیا اور وہاں بغداد اور واسط کے علماء سے اکتساب فیض کیا۔ دمشق اور بیت المقدس میں ۱۴ سال (۷۵۵ھ تا ۷۶۹ھ) قیام کیا اور وہاں بعلبک، حماۃ اور حلب وغیرہ کے مشہور علماء کرام سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ اس عرصہ

میں انھوں نے متعدد بار قاہرہ (مصر) کا سفر کیا اور وہاں کے مشہور علماء سے فیض حاصل کیا۔ ۷۷۰ھ میں مکہ مکرمہ آئے اور پچیس سال تک وہاں کی پرنور فضاؤں میں رہے۔ اس کے علاوہ بھی یہاں ان کا ورود متعدد بار ہوا اور انھوں نے یہاں کے اساطین علماء سے شرفِ تلمذ حاصل کیا۔

فیروز آبادی نے روم اور ہندوستان کا بھی سفر کیا۔ ہندوستان کے سفر میں انھوں نے سلطان سکندر شاہ اول اور سلطان محمد شاہ سے ملاقات کی۔ یہ دونوں تغلق شاہ کے بیٹے ہیں۔ ان سلاطین نے ان کی تکریم کی اور ان کے لیے وظیفہ مقرر کر دیا۔ اسی طرح روم کے سفر میں انھوں نے سلطان بایزید بن مراد سے ملاقات کی، جس نے ان کو اعزاز و اکرام سے نوازا۔ ۷۹۶ھ میں انھوں نے یمن کا سفر کیا جہاں آخر عمر تک قیام پذیر رہے۔ وہیں مقام زبید میں ان کا انتقال ہوا۔ وہاں انھوں نے بیس سال تک قیام کیا اور اس دوران میں قاضی القضاۃ کے منصب پر فائز ہوئے۔ تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ انھوں نے تصنیف و تالیف کا بیش تر کام قیام یمن کے دوران میں انجام دیا ہے۔[۹]

مشاغل و مناصب

علامہ فیروز آبادی نے اپنی عمر کے مختلف مراحل میں مختلف مشاغل اختیار کیے اور متعدد مناصب پر فائز ہوئے۔

۱- مدرسہ نظامیہ بغداد میں شیخ عبداللہ بن بکتاس کی نگرانی میں معاون مدرس کی حیثیت سے کام کیا۔

۲- بیت المقدس میں قیام کے دوران مختلف مدارس میں تدریسی خدمات انجام دیں۔

۳- ہندوستان میں دہلی میں قیام کے دوران میں درس و تدریس کی خدمات انجام دیں۔ وہ سلطان وقت کے مصاحبوں میں شامل تھے۔

۴- مکہ میں صفا کے پاس انھوں نے اپنی رہائش گاہ بنائی تھی۔ اسی جگہ مدرسہ

الملک الاشرف' کے نام سے ایک درس گاہ قائم کی اور فقہ مالکی اور فقہ شافعی کی تعلیم کے لیے اساتذہ مقرر کیے۔اسی طرح مدینہ منورہ میں قیام کے دوران بھی تدریس کی خدمات انجام دیں۔

۵- یمن میں قاضی القضاۃ کے منصب پر فائز ہوئے۔ ساتھ ہی زبید میں تدریسی خدمات بھی انجام دیں۔[۱۰]

اساتذہ

فیروز آبادی نے مختلف ممالک کا سفر کیا تھا اس لیے ان کے اساتذہ کی تعداد بہت زیادہ ہے۔بعض تذکرہ نگاروں نے ان کے جو نام گنائے ہیں ان کی تعداد سینکڑوں تک پہنچتی ہے۔ یہاں ان سب کے تذکرے کی گنجائش نہیں ہے۔ ذیل میں ان کے چند مشہور اساتذہ کا تذکرہ کیا جاتا ہے:

۱- أحمد بن مظفر بن ابی محمد النابلسی الدمشقی (م۷۶۵ھ)۔ان سے معجم ابن جمیع اور سنن ابن ماجہ کی سماعت کی۔ یہ تفسیر وحدیث کے عالم تھے۔

۲- یحییٰ بن علی بن مجلّی بن الحداد الحنفی (م۷۵۷ھ)۔ان سے الاربعین النوویۃ کی سماعت کی۔

۳- محمد بن اسماعیل بن عمر بن الحموی (م۷۵۷ھ)۔ان سے صحیح البخاری اور السنن الکبری للبیہقی کی سماعت کی اور تفسیر، فقہ اور لغت کے علوم میں استفادہ کیا۔

۴- محمد بن محمد العاقولی (م۷۹۷ھ)۔ان سے صحیح البخاری اور المشارق للصاغانی کی سماعت کی۔ یہ محدث، فقیہ، نحوی اور مفسر تھے۔

۵- ہبۃ اللہ البارزی (م۷۳۸ھ)۔ان سے صحیح مسلم کی سماعت کی۔

۶- تقی الدین السبکی (م۷۵۶ھ)۔علامہ فیروز آبادی نے ان سے اور ان کے بیٹے تاج الدین السبکی سے استفادہ کیا۔

۷- الشہاب علی بن ابی محمد الدیوان (م۷۴۳ھ)۔ان سے واسط میں دس

قراءتیں سیکھیں۔

۸- الشّمس ابوعبداللہ محمد بن یوسف الانصاری الذرندی المدنی (م۷۴۷ھ)۔ان سے صحیح البخاری کی سماعت کی اور جامع ترمذی کو سبقاً سبقاً پڑھا۔

۹- احمد بن عبدالرحمان بن محمد بن عبداللہ المرداوی الحنبلی (م۷۸۷ھ)۔

۱۰- القلقشندی، شہاب الدین ابوالعباس أحمد بن عبداللہ (م۸۲۱ھ)۔[۱۱]

یہ اساتذہ مختلف علوم وفنون کے ماہر تھے۔ فیروز آبادی نے ان سے اکتساب فیض کیا، اس لیے خود انھیں بھی مختلف علوم میں مہارت حاصل ہوگئی تھی۔

تلامذہ

علامہ فیروز آبادی سے استفادہ کرنے والوں کی بھی بہت بڑی تعداد ہے۔ان کے بعض تلامذہ نے شہرت دوام حاصل کی اور اپنے استاذ کا نام دنیا میں روشن کیا۔ ذیل میں ان کے بعض مشہور تلامذہ کا تذکرہ کیا جاتا ہے:

۱- ابن حجر العسقلانی (م۸۵۲ھ)، صاحب فتح الباری شرح صحیح البخاری۔ انھوں نے علامہ فیروز آبادی سے قاموس، حدیث اور اشعار کی سماعت کی۔

۲- جمال الدین ابومحمد عبدالرحیم بن الحسن بن علی بن عمر ابن ابراہیم الارموی الإسنوی نزیل القاہرہ۔

۳- تقی الدین محمد بن أحمد الفاسی (۷۷۵-۸۳۲ھ)۔

۴- صلاح الدین الصفدی (۶۹۶-۷۶۴ھ)۔

۵- البرہان الحلبی۔

۶- المقریزی احمد بن علی (م۸۴۰ھ)

ان کے علاوہ اور بھی بہت سے تلامذہ کا تذکرہ ملتا ہے جنھوں نے علامہ فیروز آبادی سے مختلف علوم وفنون کی تحصیل کی، بلکہ فہرست تلامذہ میں بعض خواتین کے بھی نام ملتے ہیں۔ جیسے آسیہ بنت جار اللہ بن صالح الطبری، صفیۃ بنت یاقوت المکیۃ،

رقیۃ بنت عبدالقوی البجاوی، ام محمد حبیبہ بنت احمد الشویکی، کمالیۃ بنت أحمد المکی وغیرہ۔[۱۲]

تصنیفی خدمات

علامہ فیروز آبادی نے مختلف علوم وفنون میں کافی تصنیفات یادگار چھوڑی ہیں۔ ان میں سے بعض کو کافی شہرت حاصل ہوئی۔ ذیل میں ان کا مختصراً ذکر کیا جاتا ہے:

۱- **فتح الباری بالسیح الجاری فی شرح صحیح البخاری**۔علامہ موصوف صحیح بخاری کی شرح لکھنا چاہتے تھے۔ان کا ارادہ تھا کہ کم از کم چالیس جلدوں میں یہ شرح لکھیں گے،مگر اسے مکمل نہ کرسکے۔صرف عبادات کے ایک چوتھائی حصہ تک لکھ سکے۔یہ حصہ بیس جلدوں پر مشتمل ہے۔

۲- **البلغة فی تراجم أئمة النحاة واللغة**۔یہ ایک عمدہ تصنیف ہے۔اس میں ۴۲۲ نحویوں اور ماہرینِ لغت کے تذکرے شامل ہیں۔ یہ کتاب ۱۹۷۲ء میں محمد المصری کی تحقیق وتعلیق سے وزارۃ الثقافۃ والارشاد القومی دمشق سے شائع ہوئی ہے

۳- **شوارق الاسرار العلیة فی شرح مشارق الانوار النبویة** ۔ یہ علامہ صاغانی کی کتاب مشارق الانوار کی شرح ہے۔ چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ابھی طبع نہیں ہوئی ہے۔

۴- **عمدة الحکام فی شرح عمدة الاحکام**، یہ دوجلدوں میں ہے۔

۵-**الإسعاد بالاصعاد الی درجة الجهاد**۔ یہ تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کی تصنیف علامہ فیروز آبادی نے الاشرف اسماعیل صاحب الیمن کے لیے کی تھی۔

۶- **الصلات والبشر فی الصلاة علی خیر البشر** ،یہ کتاب دمشق سے ۱۹۶۶ء میں شائع ہوئی تھی، پھر دارالقرآن سے ۱۹۸۰ء میں شائع ہوئی۔

۷- **المغانم المطابة فی معالم طابة**۔یہ مدینہ منورہ کے فضائل پر مشتمل ہے۔اس کا جغرافیائی حصہ حمد الجاسر کی تحقیق سے منشورات دارالیمامۃ الریاض سے ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا ہے، باقی حصہ ابھی مخطوطہ کی شکل میں ہے۔

۸- **إثارة الحجون إلى زيارة الحجون** ۔علامہ موصوف نے اس کی تصنیف ایک رات میں کی تھی۔اس میں حجون کے ایک معنیٰ کاہل کے ہیں اور دوسرے حجون سے مراد مکہ میں ایک پہاڑی ہے۔اس کتاب میں ان صحابہ کرامؓ کا تذکرہ ہے جن کی یہاں وفات ہوئی تھی۔

۹- **أحاسن اللطائف فی محاسن الطائف** ۔علامہ موصوف نے یہ کتاب اس زمانہ میں تصنیف کی ہے جب کچھ عرصہ طائف میں قیام کیا تھا۔ یہ ابھی زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوسکی ہے۔

۱۰- **روضة الناظر فی ترجمة الشيخ عبدالقادر** ۔یہ مشہور صوفی شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی سوانح پر مشتمل ہے۔

۱۱- **المرقاة الوفية فی طبقات الحنفية**۔

۱۲- **تسهيل طريق الوصول إلى الاحاديث الزائدة على جامع الأصول** ۔یہ کتاب چار جلدوں میں ہے۔اس کی تصنیف انھوں نے بادشاہ یمن ناصرالدین ابن الاشرف کے لیے کی تھی۔

۱۳- **الاحاديث الضعيفة**۔علامہ سخاوی کے بیان کے مطابق یہ کتاب دوجلدوں میں تھی، جب کہ علامہ الکتانی چار جلدیں بتاتے ہیں۔

۱۴- **كراسة فی علم الحديث** ۔یہ اصطلاحات حدیث کے موضوع پر ایک کتابچہ تھا۔

۱۵- **سفر السعادة** ۔یہ کتاب حدیث اور سیرت نبویہؐ پر ہے اور یہ مصر میں ۱۳۴۶ھ میں ''**كشف الغمة**'' للشعرانی کے حاشیہ پر اور ۱۳۲۲ھ میں مطبع یمنیہ سے شائع ہوئی ہے۔اس کے علاوہ اس کی اشاعت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی کتاب الفوز الکبیر مع فتح الخبیر کے مصری ایڈیشن کے حاشیے پر بھی ہوئی ہے۔

۱۶- **اللامع المعلم العجاب الجامع بين المحكم والعباب** :یہ لغت پر ہے۔شذرات الذہب میں ہے:''پانچ جلدیں مکمل ہوئیں''۔ پھر اس کا اختصار کیا اور

اس کا نام القاموس المحیط رکھا۔

۱۷- **القاموس المحیط والقابوس الوسیط، الجامع لما ذھب من لغۃ العرب شماطیط** ۔علامہ فیروز آبادی کی اس کتاب نے عالم گیر شہرت حاصل کی۔ دنیا کی شاید ہی کوئی قابل ذکر لائبریری ہو جس میں یہ کتاب موجود نہ ہو۔ اس کی بہت سی شروح لکھی گئی ہیں اور اس کے خلاصے بھی کیے گئے ہیں۔ اس کتاب کے مصر، لبنان اور ہندوستان (کلکتہ، بمبئی، لکھنؤ) سے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اس کا ترکی اور فارسی میں بھی ترجمہ کیا گیا ہے۔

۱۸- **تجسیر الموشین فیما یقال بالسین والشین** ۔ یہ کتاب ۱۳۲۷ھ میں علامہ البقاعی کی تحقیق سے شائع ہوئی ہے۔

۱۹- **الدرر المبثثۃ فی الغرر المثلثۃ**، یہ کتاب ڈاکٹر علی حسین البواب کی تحقیق سے ۱۹۸۲ء میں سعودی عرب سے شائع ہوئی ہے۔

۲۰- **الاشارات الی ما فی کتب الفقہ من الاسماء والاماکن واللغات**۔ یہ مخطوطہ کی شکل میں ہے۔

۲۱- **نزھۃ الطالین وتحفۃ الراغبین فی شرح قصیدہ البردۃ**۔[۱۳]

فیروز آبادی کی تفسیری خدمات

فنِ تفسیر میں علامہ فیروز آبادی کی درج ذیل یادگاریں ملتی ہیں:

۱- **بصائر ذوی التمییز فی لطائف الکتاب العزیز** ۔یہ کتاب چھ جلدوں میں ہے۔ محمد علی النجار کی تحقیق سے المکتبۃ العلمیۃ بیروت سے شائع ہوئی ہے۔ ۱۳۸۳ھ میں قاہرہ سے اس کا دوسرا ایڈیشن بھی شائع ہو گیا ہے۔

۲- **تنویر المقیاس من تفسیر ابن عباس**: یہ کتاب چار جلدوں میں ہے۔ ۱۲۹۰ھ میں بولاق، ۱۳۰۲ھ میں بمبئی، ۱۳۱۴ھ میں قاہرہ اور ۱۳۷۷ھ میں ایران سے شائع ہوئی ہے۔ قاہرہ کی اشاعت علامہ سیوطی کی 'الدر المنثور فی الماثور' کے حاشیے پر اور ایران کی اشاعت تفسیر خازن کے حاشیے پر ہوئی ہے۔

۳- **تیسیر فاتحة الإھاب فی تفسیر فاتحة الکتاب** :یہ ایک جلد میں ہے اور مخطوطہ کی شکل میں ہے۔علامہ فیروز آبادی نے اس کی تصنیف ایک رات میں کی تھی۔

۴- **الدر النظیم المرشد الی مقاصد القرآن الکریم** ۔یہ کتاب اب نایاب ہے۔

۵- **حاصل کورة الخلاص فی فضائل سورة الاخلاص** : یہ کتاب بھی اب نایاب ہے۔

۶- **خطبة الکشاف او بغیة الرشاف / شرح خطبة الکشاف**: یہ کتاب ایک بار مصنف کی زندگی میں تلف ہوگئی تھی۔انھوں نے پھر اس کی تسوید کی اور اس کا نام 'نغبۃ الرشاف من خطبۃ الکشاف' رکھا۔یہ کتاب ابھی غیر مطبوع ہے۔

۷- **جزء فی فضل سورة یٰسٓ** :اس کی جمع وترتیب شیخ اسماعیل بن ابراہیم الہاشم العقیل نے کی ہے۔

۸- **الوجیز فی لطائف الکتاب العزیز** :بعض تذکرہ نگاروں نے اس کو الگ تصنیف شمار کیا ہے، جب کہ بعض اسے البصائر ہی سمجھتے ہیں۔[۱۴]

تفسیری منہج

علامہ فیروز آبادی نے اپنی تفسیری کتب، خاص طور سے اول الذکر کتاب 'بصائر ذوی التمییز فی لطائف الکتاب العزیز' میں جو منہج اختیار کیا ہے وہ وہی ہے جسے سلف کا منہج کہا جاتا ہے، یعنی قرآنی آیات کی تفسیر سب سے پہلے قرآنی آیات سے کی جائے، پھر رسول اللہ ﷺ کے ارشادات اور اقوال صحابہؓ سے، پھر لغت اور کلام عرب اور قدیم مفسّرین اور فقہاء وغیرہ کے اقوال سے۔ذیل میں مثالوں کے ذریعے اس اجمال کی تفصیل بیان کی جاتی ہے۔

قرآن کی تفسیر قرآن سے

علامہ موصوف نے تفسیر القرآن بالقرآن کے معاملے میں مختلف طریقے اختیار

کیے ہیں۔ کہیں متعلقہ تمام آیات کو بیان کر دیا ہے، کہیں بعض آیات نقل کی ہیں اور بعض آیات کو قاری کے فہم پر چھوڑ دیا ہے۔ کہیں کسی آیت کے صرف ایک ٹکڑے کو نقل کیا ہے اور بقیہ حصہ کو چھوڑ دیا ہے۔ کہیں کہیں مشابہ آیات کو ایک مفہوم کی تشریح کے ضمن میں جمع کر دیا ہے۔ کہیں محض آیات نقل کی ہیں اور ان سے استنباط سے اجتناب کیا ہے۔ کہیں استنباط معنیٰ کے ذیل میں طوالت سے کام لیا ہے، جیسے لفظ اللہ تعالیٰ کی تشریح میں ایک سو بیس سے زائد صورتیں بیان کی ہیں، جس میں اللہ تعالیٰ کے جلال و جمال اور ربوبیت و کمال کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے۔ اسی طرح اولو، اولی اور اولات کے ضمن میں قرآن کے پندرہ مقامات کا صرف حوالہ دیا ہے اور تفصیل سے گریز کیا ہے۔[۱۵]

دیگر آیات کے ذریعے کسی آیت کی تشریح کے سلسلے میں یہ مثال پیش کی جاسکتی ہے کہ علامہ موصوف نے لفظ 'بغی' کے پانچ معانی بیان کیے ہیں۔ اس کا ایک معنیٰ ظلم ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَيَنْهَى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ وَالْبَغْيِ (النحل:۹۰) ''اللہ تعالیٰ فحش منکر اور ظلم سے منع کرتا ہے''۔ اس کا دوسرا معنیٰ معصیت اور گناہ کا ہے جیسے يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّمَا بَغْيُكُمْ عَلَى أَنفُسِكُم (یونس:۲۳) ''اے لوگو تمہاری معصیتیں تمہارے خلاف ہیں''۔ فَلَمَّا أَنجَاهُمْ إِذَا هُمْ يَبْغُونَ (یونس:۲۳) ''جب ہم نے ان کو مصیبت سے نجات دے دی تو وہ گناہ کرنے لگ گئے''۔ لیکن موصوف نے دو ہی مثالیں نقل کی ہیں۔

بادی النظر میں قرآن کی بعض آیات یا الفاظ باہم متعارض واقع ہوئے ہیں، لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ اگر بہ نظر دقّت ان پر غور کیا جائے تو کوئی تعارض باقی نہیں رہتا۔ علامہ موصوف نے اس طرح کی بعض آیات اور الفاظ کا حوالہ دیا ہے اور ان کے ظاہری تعارض کو رفع کیا ہے، جیسے قرآن میں ''نحن'' کا لفظ عموماً جمع ضمیر کے لیے استعمال ہوتا ہے، لیکن متعدد مقامات پر اس کا استعمال اللہ تعالیٰ کے لیے ہوا ہے، حالاں کہ اس کی ذات واحد ہے، جیسے نَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنكُمْ (الواقعہ:۸۵) انھوں نے بیان کیا ہے کہ اس طرح کے جملہ مقامات میں اللہ تعالیٰ کی شانِ ملوکیت جلوہ گر ہوتی

ہے۔اسی طرح جہاں بھی جمع کا صیغہ استعمال ہوا ہے وہاں مذکورہ فعل کی انجام دہی میں ملائکہ یا اولیاء کی شمولیت بھی ہوتی ہے جیسے إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ (الحجر:۹) یعنی قرآن کو ہم نے نازل کیا ہے۔قرآن کا نازل کرنے والا حقیقتاً اللہ تعالیٰ ہی ہے مگر نزول میں حضرت جبرئیلؑ شامل ہیں۔۱۶

علامہ موصوف نے بعض آیات کی تفسیر کے وقت اشارہ یا تنبیہ کے الفاظ سے قاری کی توجہ مبذول کی ہے جیسے درج ذیل آیات:

اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ. الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ۔(العلق:۳-۴) ''پڑھو اپنے معزز رب کے نام سے جس نے تمھیں قلم سے سکھایا''۔اس کے ضمن میں موصوف لکھتے ہیں:

اشـــارة و تنبيه الى ما انعم به على الانسـان فى تـعـلـم الكتابة وما فى القلم من الفوائد و اللطائف۔۱۷	اس آیت میں اس بات کی طرف اشارہ اور تنبیہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو قلم کے ذریعے لکھنے کا ہنر سکھایا اور یہ کہ اس کے بے شمار فوائد واستعمالات ہیں۔

اسی طرح آیت: لِيَحْمِلُوا أَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔(النمل:۲۵) کے ضمن میں لکھتے ہیں:

تنبيه على انه يحصل كمال العقوبة	اس آیت میں اس بات پر متنبہ کیا گیا ہے کہ انہیں روز قیامت پوری پوری سزا ملے گی۔

علامہ موصوف نے اپنی تفسیر میں بعض مقامات پر کسی آیت کی تشریح میں قرآنی تشریحات کا مجمل ذکر تو کیا ہے،لیکن تفصیل بیان نہیں کی ہے، بلکہ اس کے بجائے لغوی تشریح کرنے لگتے ہیں، جیسے 'کلّا' کی تشریح میں فرماتے ہیں: ''قرآن میں یہ بارہ صورتوں میں مستعمل ہے''۔لیکن یہاں انھوں نے ان آیات کو نقل نہیں کیا ہے جن میں لفظ 'کلّا' وارد ہوا ہے، بلکہ سیبویہ، خلیل، مبرد، زجاج اور اکثر نحویوں کے حوالے سے لکھا ہے کہ اس کے معنی الردع والزجر (جھڑکنے اور ڈانٹنے) کے ہیں۔۱۸

علامہ موصوف نے مختلف آیات کی تاویلیں بھی نقل کی ہیں۔مثال کے طور پر

آیت وَأَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهُ ظَاهِرَةً وَبَاطِنَةً (لقمان :۲۰) کی تشریح میں لکھتے ہیں: ''کہا گیا ہے کہ ظاہری نعمت سے مراد نبوت اور باطنی نعمت سے مراد عقل ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ظاہری نعمت سے مراد محسوسات اور باطنی نعمت سے مراد معقولات ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ظاہری نعمت سے مراد دشمنوں کے خلاف مدد اور باطنی نعمت سے مراد فرشتوں کے ذریعے مدد ہے۔ ان میں سے ہر بات آیت کے مفہوم میں شامل ہے۔ واللہ اعلم۔۱۹

آیت اَللّٰهُ يَسْتَهْزِءُ بِهِمْ (البقرہ:۱۵) کے ذیل میں کہتے ہیں کہ ''حقیقت میں استہزاء کا انتساب اللہ تعالیٰ کی طرف صحیح نہیں ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ کی طرف لہو و لعب کا انتساب صحیح نہیں ہے، بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ ان (منافقین) کے استہزاء کا بدلہ دے گا''۔۲۰

بصائر ذوی التمییز کے علاوہ علامہ موصوف کی دوسری اہم تفسیر 'تنویر المقیاس' ہے۔ اس کا منہج اول الذکر تفسیر سے مختلف ہے۔ اس میں انھوں نے مفردات کی تشریح پر اکتفا کیا ہے۔ البتہ بعض آیات کی تشریح کے ضمن میں دوسری آیات کا حوالہ دیا ہے مگر انہیں نقل نہیں کیا ہے۔ جیسے آیت وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِم مِّنْ غِلٍّ تَجْرِي مِن تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ (الاعراف:۴۳) کے ذیل میں شراب، پانی، شہد اور دودھ کی نہروں کا ذکر کیا ہے جو سورۂ محمد آیت ۱۵ میں مذکور ہے۔۲۱ مگر آیت نقل نہیں کی ہے۔ اسی طرح آیت وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى تِسْعَ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ (الاسراء:۱۰۱) کے ذیل میں نو نشانیوں **ید، عصا، طوفان، جراد، قمل، ضفادع، دم، سنین اور طمس اموال** کا حوالہ دیا ہے۔ قرآن میں ان کا تفصیلی ذکر سورۃ الاعراف آیت ۱۳۰-۱۳۳ میں آیا ہے، مگر موصوف نے یہ آیات نقل نہیں کی ہیں۔۲۲

تفسیر بالماثور

علامہ فیروزآبادی نے تفسیر بالماثور (یعنی قرآن کی تفسیر احادیث رسول اللہ

ﷺ اور اقوال صحابہ کے ذریعے) کے طریقے کو بھی اختیار کیا ہے اور حسب ضرورت احادیث و روایات نقل کی ہیں، جن میں کتب ستہ اور دیگر مشہور کتب احادیث کی روایات شامل ہیں، مگر اس بارے میں انھوں نے پورے طور پر محدثانہ طریقہ اختیار نہیں کیا ہے، بلکہ صحیح، ضعیف، حتی کہ بعض مقامات پر موضوع روایات بھی نقل کر دی ہیں۔ کچھ جگہوں میں حدیث کے مآخذ کا حوالہ دے دیا ہے، مگر اکثر مقامات پر روایات بغیر مآخذ کی صراحت کے نقل کر دی ہیں۔ اسی طرح سند کے ذکر کا اہتمام نہیں کیا ہے۔[۲۳] ذیل میں تفسیر بالماثور کے ضمن میں دو آیات نقل کی جا رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ قَدَراً مَّقْدُوراً** (الاحزاب: ۳۸) اس آیت کے ذیل میں علامہ موصوف لکھتے ہیں: ''قدر سے مراد وہ تقدیر ہے جو لوح محفوظ میں لکھی ہوئی ہے اور جس کی طرف رسول اللہ ﷺ نے اشارہ فرمایا ہے کہ تمہارا رب تم سے متعلق چار چیزوں کے بارے میں فارغ ہو چکا ہے: تخلیق سعادت وشقاوت، موت اور رزق۔[۲۴] آیت "**یوم الحج الاکبر**" (التوبۃ: ۳) کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ حج کو حج اکبر اس لیے کہا گیا ہے کیوں کہ حدیث میں عمرہ کو حج اصغر (چھوٹا حج) سے موسوم کیا گیا ہے''۔[۲۵]

اقوال مفسرین سے استفادہ

علامہ فیروز آبادی نے آیات قرآنی کی تفسیر میں اقوال مفسرین سے بھی استفادہ کیا ہے اور جا بہ جا کہیں ناموں کی صراحت کے ساتھ اور کہیں بغیر صراحت کے ان کے اقوال ذکر کیے ہیں۔ جن مفسرین سے علامہ موصوف نے استفادہ کیا ہے ان کی تعداد بہت ہے۔ ان میں ابن جریر طبری، زمخشری، رازی، ابن کثیر، ماوردی، ابن عطیہ اندلسی، ابوحیان توحیدی، راغب اصفہانی، معینی، مہدوی، محمود کرمانی، خطیب اسکافی، محمد نیساپوری، حسن بن علی اہوازی اور قفال شاشی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔[۲۶] تفسیر قرآن میں اختلاف قراءت ایک اہم موضوع ہے۔ اس سے بعض آیات و الفاظ کے معنی و مفہوم کی تعیین میں مدد ملتی ہے اور آیتوں کے ایک دوسرے پہلو پر روشنی بھی پڑتی ہے۔ علامہ

فیروز آبادی نے اختلاف قراءت کے ضمن میں بعض قراء کرام کے نام ذکر کیے ہیں اور بعض مقامات پر بغیر ناموں کی صراحت کے صرف قراءتوں کا اختلاف نقل کیا ہے۔[۲۷] علامہ موصوف نے اقوال مفسرین اور اختلاف قراءت کو محض نقل کر دینے پر اکتفا نہیں کیا ہے، بلکہ ان کا تجزیہ بھی کیا ہے اور ان میں راجح اور مرجوح کو نمایاں کیا ہے، بعض مفسرین کی تحقیق پر اضافہ کیا ہے اور بعض پر تنقید بھی کی ہے۔[۲۸]

علمائے لغت ونحو کے اقوال سے استفادہ

اقوال مفسرین کے ساتھ موصوف نے علمائے لغت ونحو کے اقوال سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں مختلف اصطلاحات استعمال کی ہیں۔ جیسے **اھل اللغة، اللغویون، البیانیون، البصریون، الکوفیون اور النحاة** وغیرہ۔ ساتھ ہی ان کے اقوال کا بھی تجزیہ کیا ہے اور ان میں سے راجح ومرجوح کو متعین کیا ہے نیز ان پر تنقید بھی کی ہے۔ اقوال اہل لغت سے تفسیر قرآن کی دو مثالیں ملاحظہ ہوں:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَيَكُونُونَ عَلَيْهِمْ ضِدّاً۔ (مریم:۸۲) اور وہ الٹے ان کے مخالف بن جائیں گے۔

اس آیت کے ذیل میں علامہ موصوف لکھتے ہیں:

قال الفرّاء ای عوناً فلذلک وحده، وقال عکرمة الی اعداء، وقال الاخفش الضد یکون واحد ویکون جمعا، وقال الازهری یعنی الاصنام التی عبدها الکفار تکون عونا علی عابدیها.[۲۹]

فراء نے کہا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اس کے مددگار ہوں گے، اس لیے ضد کو واحد لایا گیا ہے۔ عکرمہ نے کہا کہ وہ ان کے دشمن بن جائیں گے۔ اخفش نے کہا کہ لفظ ضد کا استعمال واحد بھی ہوتا ہے اور بہ طور جمع بھی۔ ازہری نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ بت ہیں جن کی کفار عبادت کرتے تھے کہ وہ ان کے مددگار ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاِذَا الْوُحُوشُ حُشِرَتْ۔(التکویر:۵) اور جب جنگلی جانور سمیٹ کر اکٹھے کر دیے جائیں گے۔

اس آیت کے ضمن میں علامہ فیروز آبادی لکھتے ہیں:

الازھری واکثر المفسرین قالوا، تحشر الوحوش کلھا والدواب حتی الذباب تحشر للقصاص، والمحشر موضع الحشر۔[۳۰]

ازہری اور اکثر مفسرین نے کہا ہے کہ قیامت کے دن میدان حشر میں تمام جانور اور چوپائے یہاں تک کہ مکھیاں بھی قصاص کے لیے جمع کی جائیں گی اور محشر جمع ہونے کی جگہ کو کہا جاتا ہے۔

موصوف نے اشعار سے بھی استفادہ کیا ہے اس ضمن میں انھوں نے کہیں شاعر کا نام صراحت سے ذکر کیا ہے اور کبھی نہیں کیا ہے۔ بعض مقامات پر شعر پر تنقید بھی کی ہے اور دوسرے کی تنقید کو نقل بھی کیا ہے۔[۳۱]

فقہاء کی رایوں سے استفادہ

قرآن میں بہت سی آیات احکامی ہیں، اس ضمن میں علامہ موصوف نے فقہاء کے اقوال و آراء کو بھی تفسیر قرآن میں پیش کیا ہے اگر چہ ایسی مثالیں ذرا کم ہیں۔ ذیل میں ایک دو مثالیں پیش کی جارہی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَالَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَائِهِمْ ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا۔(المجادلۃ:۳) جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کریں پھر اپنی اس بات سے رجوع کریں۔

اس کے ذیل میں علامہ موصوف نے فقہاء کے بعض اقوال نقل کیے ہیں، لکھتے ہیں:

عند اھل الظاھر ان یقول ذلک للمرأۃ ثانیا فحینئذ تلزمہ الکفارۃ.

اہل ظاہر کے نزدیک 'عود' یہ ہے کہ آدمی دوسری بار اپنی بیوی سے وہی بات کہے۔ اس وقت

وعند الشافعی ھو امساکھا بعد وقوع الظھار علیھا مدۃ یمکنہ ان یطلق فیھا فلم یفعل، عند ابی حنیفۃ العود فی الظھار ھو ان یجامعھا بعدان ظاھر منھا، و قال بعض الفقھاء المظاھرہ ھو یمین نحو ان یقول امرأتی علیّ کظھر امی ان فعلت کذا فمتی فعلت ذلک حنث ولزمہ من الکفارۃ ما بینہ اللہ تعالیٰ فی ھذا السکان۔۳۲

کفارہ لازم آئے گا، امام شافعیؒ کے نزدیک ظہار کے واقع ہونے کے بعد بیوی کو مدت تک روکے رکھے کہ اس دوران اس کو طلاق دے دے گا، اگر ایسا نہ کرے تو کفارہ لازم آئے گا۔امام ابوحنیفہ کے نزدیک عود ظہار میں ہے یعنی ظہار کے بعد بیوی سے جماع کرلے تو کفارہ لازم آئے گا۔بعض فقہاء نے کہا ظہار قسم کی ایک صورت ہے کہ آدمی اپنی بیوی سے کہے کہ اگر تم نے ایسا کیا تو تم میری ماں کی طرح ہو، پس جب وہ ایسا کرے گی تو مرد حانث ہوگا اور کفارہ لازم آئے گا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں فرمایا ہے۔

بعض آیات کی تشریح میں علامہ نے فقہاء کی آراء نقل کرکے ان کا تجزیہ کیا ہے اور ان میں قابل ترجیح قول کو نمایاں کیا ہے، جیسے الصلوٰۃ الوسطیٰ کے ذیل میں انھوں نے فقہاء کے بہت سے اقوال نقل کیے ہیں۔ان میں فجر، ظہر، عصر، مغرب، عشاء، جمعہ اور عیدین ہر نماز کو صلاۃ وسطیٰ کہا گیا ہے۔علامہ موصوف نے اس ضمن میں رسول اللہ ﷺ کا وہ ارشاد نقل کیا ہے جو آپ نے غزوۂ احزاب کے موقع پر فرمایا تھا:

شغلونا عن الصلاۃ الوسطیٰ صلاۃ العصر ملا اللہ بیوتھم و قلوبھم نارا۔۳۳

کفار نے ہمیں صلاۃ وسطیٰ صلاۃ عصر سے غافل کردیا اللہ تعالیٰ ان کے گھروں اور دلوں کو آگ سے بھردے۔

اس کے بعد لکھا ہے کہ:

واقوی الاقوال ثلاثۃ العصر، الصبح، الجمعۃ۔

زیادہ مضبوط قول تین نمازوں کے بارے میں ہے: عصر، صبح، اور جمعہ۔

صوفیہ کے اقوال سے استفادہ

علامہ موصوف نے بعض قرآنی آیات کی تشریح میں صوفیہ کے اقوال سے بھی استفادہ کیا ہے، خاص طور سے توکل، رضا، زہد جیسی اصطلاحات کے ضمن میں ان کے اقوال پیش کر کے ان کا محاکمہ کیا ہے۔

مثلاً توکل کے ذیل میں لکھا ہے:

قال ابن عطاء هو ان لا يظهر فيه انزعاج الى الاسباب، مع شدة فاقته اليها ولايزول عن حقيقة السكون الى الحق مع وقوفه عليها وقيل ترک التدبير النفس، والانخلاع من الحول والقوة وانما يقوى العبد على التوكل اذا علم ان الحق سبحانه يعلم ويرى ماهو فيه۔[۳۴]

ابن عطاء نے کہا کہ توکل یہ ہے کہ شدید حاجت کے باوجود اسباب کا سہارا نہ لیا جائے اور حق تعالیٰ پر مکمل اعتماد قائم رہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ توکل یہ ہے کہ نفس تدبیر کو ترک کر دے اور طاقت وقوت کے حصول سے بالکلیہ دست بردار ہوجائے اور توکل بندے کو تقویت دیتا ہے جب بندہ خیال کرے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ اس کی حالت سے واقف ہے اور اسے دیکھ رہا ہے۔

معرفت کے ذیل میں بعض صوفیہ کا کلام نقل کرتے ہیں:

وان الطائفة المتصوفة- نفع الله بهم- يرجحون المعرفة على العلم وتكلموا فى المعرفة بآثارها فقال الشبلى ليس لعارف علاقة ولا لمحب شكوى ولا لعبد دعوى ولا لخائف قرار ولا لاحد من الله فرار، وهذا كلام جيد وقال احمد بن

صوفیاء کی ایک جماعت نے (اللہ ان سے لوگوں کو فائدہ پہنچائے) معرفت کو علم پر ترجیح دی ہے اور اس کے آثار پر بحث کی ہے۔ شبلی نے کہا ہے کہ 'عارف کے لیے کوئی تعلق خاطر کی چیز (اللہ کے سوا) نہیں ہے اور محبت کرنے والے کے لیے شکایت کی گنجائش نہیں ہے اور بندہ کے لیے اللہ کے خلاف دعویٰ کرنے کا حق نہیں ہے اور آخرت میں عذاب سے ڈرنے والے کے لیے قرار نہیں

عاصم من کان بالله اعرف کان من الله أخوف۔۳۵ ہے اور کسی مخلوق کے لیے اللہ تعالیٰ سے فرار کی جگہ نہیں ہے۔'' یہ بہترین کلام ہے، احمد بن عاصم نے کہا ہے کہ جو اللہ کی زیادہ معرفت رکھے گا وہ اللہ تعالیٰ سے زیادہ خوف کرے گا۔

علوم قرآن کے بعض مباحث

تفسیر قرآن میں بعض متعلقات قرآن جیسے اعجاز قرآن، اسباب نزول، حروف مقطعات، ناسخ ومنسوخ، ترتیب سور اور فضائل سور و آیات کی خصوصی اہمیت ہے۔ قدیم و جدید تمام مفسرین نے اپنی تفسیروں میں ان سے بحث کی ہے۔ علامہ فیروزآبادی نے بھی ان پر اظہار خیال کیا ہے، مثلاً اعجاز قرآن کے ضمن میں انھوں نے پہلے اعجاز کی لغوی و معنوی تشریح کی ہے، پھر معجزہ اور خرق عادت میں فرق کو بیان کیا ہے، پھر قرآن کو سب سے بڑا معجزہ قرار دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

وأفضل معجزاته واكملها واجلها واعظمها: القرآن الذی نزل علیه بافصح اللغات واصحها وأبلغها۔۳۶ نبی کریم ﷺ کے تمام معجزات میں افضل، اکمل اور سب سے بڑا معجزہ قرآن ہے جو آپؐ پر نازل کیا گیا اور جو فصیح ترین اور بلیغ ترین اسلوب میں ہے۔

اس کے بعد اعجاز کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے جن میں لفظی اور معنوی ہر طرح کا اعجاز شامل ہے۔

اسباب نزول کے تعلق سے لکھتے ہیں:

اعلم ان نزول آیات القرآن و اسبابه وترتیب السور المكية والمدنية من أشرف علوم القرآن۔۳۷ جان لو کہ قرآن کی آیات کا نزول اور ان کے اسباب اور سورتوں کی ترتیب مکی اور مدنی ہونے کا جاننا قرآن کے بہترین علوم میں سے ہے۔

حروف مقطعات کے بارے میں علماء ومفسرین کی آراء واقوال مختلف رہے

ہیں۔ علامہ فیروز آبادی نے ان کے بارے میں کوئی واضح موقف اختیار نہ کر کے علماء و مفسرین کے اقوال نقل کر دیے ہیں، جیسے امام شعبی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ''حروف مقطعات قرآن کے راز ہیں''۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ سے منسوب یہ قول بیان کیا ہے کہ ''ہر کتاب کا ایک سرّ (راز) ہوتا ہے اور قرآن کا سرّ اس کے حروف مقطعات ہیں''۔ عبداللہ ابن مسعود کا قول بھی نقل کیا ہے کہ ''یہ مخفی اور پوشیدہ علم ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے محفوظ رکھا ہے'' یعنی بندوں کو اس سے آگاہ نہیں کیا ہے۔

بعض حروف مقطعات کے معنیٰ بعض مفسرین نے متعین کرنے کی کوشش کی ہے جیسے طٰہٰ، یٰسین وغیرہ۔ علامہ موصوف نے ان کے اقوال کو قبول کیا ہے۔ آخر میں انھوں نے لکھا ہے کہ ان حروف کے ذریعے بھی اہل عرب کو تحدی کی گئی ہے کہ وہ ان کے معنی بتائیں۔[۳۸]

فہم قرآن کے لیے ناسخ و منسوخ کا علم ضروری ہے۔ تمام مفسّرین نے اس کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔ علامہ فیروز آبادی نے بھی اس کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے اور لکھا ہے کہ فہم قرآن کے لیے یہ ایک ضروری علم ہے۔ لکھتے ہیں:

اعلم ان معرفة الناسخ والمنسوخ باب عظيم من علوم القرآن، ومن اراد ان يخوض فی بحر التفسير ففرض عليه الشروع فی طلب معرفته والاطلاع علی اسراره يسلم من الاغلاط والخطأ الفاحش والتاويلات المكروهة۔[۳۹]

جان لو کہ ناسخ و منسوخ کا جاننا قرآن کا ایک متہم بالشان علم ہے اور جو شخص بحر تفسیر میں غوّاصی کا خواہش مند ہے اس پر لازم ہے کہ پہلے اس کی معرفت حاصل کرے اور اس کے اسرار و رموز کو جانے، تاکہ سخت غلطی اور خطا اور ناپسندیدہ تاویلات سے محفوظ رہے۔

ناسخ و منسوخ کے حوالے سے علامہ موصوف نے یہود و نصاریٰ، روافض اور اہل السنۃ والجماعۃ کے موقف کو بیان کیا ہے اور قرآن میں ان کی موجودگی کو تسلیم کیا ہے پھر نسخ کی لغوی و معنوی تشریح کی ہے اور اس کی اقسام، سبب اور حکمت پر روشنی ڈالی ہے۔[۴۰]

تفسیری مأخذ میں اسرائیلیات کا حوالہ بھی دیا جاتا ہے۔ مفسّرین اس معاملے

میں افراط وتفریط کا شکار رہے ہیں۔ بعض مفسّرین نے علی الاطلاق اسرائیلی روایات کو اپنی کتب تفاسیر میں جگہ دی ہے، جیسے محمد بن جریر طبری اور امام ثعلبی وغیرہ۔ بعض مفسرین نے احتیاط سے کام لیا ہے اور اسرائیلی روایات کو کم از کم بیان کیا ہے۔ علامہ فیروز آبادی نے اسرائیلی روایات سے استفادہ کیا ہے، مگر ان کے بارے میں بعض مقامات پر تنبیہ کردی ہے اور بعض مقامات پر تنبیہ کرنے سے گریز کیا ہے۔ اس بارے میں انھوں نے بیضاوی اور زمخشری پر اعتماد کیا ہے اور ان کے نقش قدم کی پیروی کی ہے۔[۴۱]

حواشی ومراجع

۱۔ التاج المکلل من جواہر مآثر الطراز الآخر والاول، صدیق حسن خان القنوجی، تصحیح و تعلیق: د عبدالحکیم شرف الدین، دار اقرا، المطبعۃ الہندیۃ العربیۃ ۱۹۶۳ء، ص ۴۶۶، طبقات الحفاظ والمفسرین، السیوطی، اعداد و دراسۃ عبدالعزیز السیروان، عالم الکتب بیروت، ط ۱، ۱۹۸۴ء، ص ۲۸۷۔

۲۔ مفتاح السعادۃ، طاش کبری زادۃ، مراجعہ وتحقیق: کامل بکری، عبدالوہاب ابوالنور، دارالاستقلال الکبریٰ القاہرہ، ۱/ ۱۱۹، بصائر ذوی التمییز فی لطائف الکتاب العزیز، الفیروزآبادی، تحقیق الاستاذ محمد علی النجار، المقدمہ، المکتبۃ العلمیۃ، بیروت، ۱/ ۱۹، الضوء اللامع لاہل القرن التاسع، شمس الدین محمد بن عبدالرحمان السخاوی، منشورات دار مکتبۃ الحیاۃ، بیروت، ۱۰/ ۷۹

۳۔ دراسات فی القاموس المحیط، د محمد مصطفیٰ رضوان، منشورات الجامعہ اللیبیۃ، ص ۲۴

۴۔ تاج العروس من جواہر القاموس، مرتضی الزبیدی، المطبعۃ الخیریۃ مصر، ۱۳۰۶ھ، ۱/ ۱۲، البدر الطالع بمحاسن من بعد القرن التاسع، القاضی محمد بن علی الشوکانی، دار المعرفۃ بیروت، ۲/ ۲۸۰، مفتاح السعادۃ، ۱/ ۱۲۰-۱۱۹، العقد الثمین فی تاریخ البلد الأمین، ابوالطیب التقی الفاسی/ محمد بن احمد الحسنی، تحقیق: فواد سید، مطبعۃ السنۃ المحمدیۃ القاہرہ، ۱۳۹۱ھ/ ۱۹۶۲ء، ۲/ ۳۹۹، طبقات صلحاء الیمن، عبدالوہاب عبدالرحمان

البریھی السکسکی، تحقیق: عبداللہ محمد الحبشی، مرکز الدراسات والبحوث الیمنی صنعاء، دارالآداب بیروت، ۱۴۰۳ھ/۱۹۸۳ء، ص۲۹۳

۵ الضوء اللامع، ۱۰/۷۹، إنباء الغمر بأبناء العمر فی التاریخ، ابن حجر العسقلانی، دارالکتب العلمیۃ بیروت، ۱۴۰۶ھ/ ۱۹۸۶ء، ۷/۱۶۰، الاعلام، خیر الدین الزرکلی، دارالعلم للملایین، بیروت، ۱۹۸۴ء، ۷/۱۴۶، تقویم البلدان، ابوالفداء عماد الدین بن اسماعیل، دارالطباعۃ السلطانیۃ پیرس، ۱۸۵۰ء، ص۳۲۸-۳۲۹

۶ العقد الثمین، ۲/ ۴۰۰

۷ حوالہ سابق، ۲/۳۹۹

۸ الضوءاللامع، ۱۰۷۹، إنباء الغمر، ۷/ ۱۵۹

۹ طبقات المفسرین، الداؤدی، تحقیق: علی محمد عمر، دارالکتب العلمیۃ، بیروت، ص۲۷۴، الضوء اللامع، ۱۰/۸۰، العقد الثمین، ۲/ ۳۹۸، تحبیر الموشین فی التعبیر بالسین والشین، مجدالدین الفیروزآبادی، تحقیق: محمد خیر محمود البقاعی، دارقتیبۃ، ۱۴۰۳ھ/ ۱۹۸۳ء، ص۸، النجوم الزاہرۃ فی ملوک مصر والقاہرہ، ابن تغری بردی، تعلیق: محمد حسین شمس الدین، دارالکتب العلمیۃ، المؤسسۃ المصریۃ للنشر ۱۹۹۲ء، ۱۱/۸۲-۸۳، البصائر، ۳/۴۲۶، تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ، جرجی زیدان، منشورات مکتبۃ الحیاۃ بیروت، ۱۹۸۳، ص۱۵۳، العقود اللؤلؤیۃ فی تاریخ الدولۃ الرسولیۃ، علی بن الحسن الخزرجی، تحقیق: محمد بن علی الاکوع الحوالی، مرکز الدراسات والبحوث الیمنی صنعاء، ۲/ ۲۴۹، التاج المکلل ۴۶۷، المسجد المسبوک والجوہر المحکوک فی طبقات الخلفاء والملوک، الملک الاشرف الغسانی، دارالبیان بغداد، ۱۳۹۵ھ/ ۱۹۷۵ء، ۲/ ۶۸

۱۰ العقود اللؤلؤیۃ، ۲/ ۲۳۵

۱۱ علامہ فیروزآبادی کے اساتذہ کے تذکروں کے لیے ملاحظہ کیجیے: العقد الثمین، ۲/۳۹۲، الضوء اللامع، ۱۰/۸۰، الدرر الکامنۃ فی اعیان المائۃ الثامنۃ، ابن حجر العسقلانی، دارالکتب الحدیثۃ القاہرۃ، ۴/ ۳۹۵، فہرس الفہارس والاثبات المعجم المعاجم والمشیخات والمسلسلات، عبدالحی الکتانی، دارالغرب الاسلامی بیروت، ۲/ ۶۵۸،

شذرات الذہب فی اخبار عن ذہب، ابن العماد الحنبلی، ۷/۱۲۸، تاج العروس، ۱/۱۳

۱۲ علامہ فیروزآبادی کے تلامذہ کے تذکروں کے لیے دیکھیے: تاج العروس، ۱/ ۱۵، فہرس الفہارس، ۲/ ۹۰۷-۹۰۸، العسجد المسبوک، ۲/ ۶۹، طبقات صلحاء الیمن، ص ۸۹، ۱۳۹، ۱۵۹، ۱۹۶، ۱۹۸، المثلث المختلف المعنی للفیروزآبادی، تحقیق عبدالجلیل معتاط، عودۃ التمیم، جامعہ سبہا، لیبیا ۱۹۸۸ء، ص ۲۰۳،۲۴، وغیرہ۔

۱۳ الضوء اللامع، ۱۰/ ۸۱، ۸۲، بغیۃ الوعاۃ للسیوطی، ص ۲۷۴، طبقات صلحاء الیمن، ص ۲۹۴، کشف الظنون، حاجی خلیفہ، ۱/ ۱۴۸، ۱۴۹، ۲/ ۵۲۵، ۵۵۲، ہدیۃ العارفین، أسماء المؤلفین وآثار المصنفین من کشف الظنون، اسماعیل پاشا البغدادی، دارالفکر بیروت، ۶/ ۱۸۱، ۱۸۲، علم التاریخ عند المسلمین، ص ۵۶۷، ۶۵۹، شذرات الذہب، ۷/ ۱۲۸، العقد الثمین، ۲/ ۳۹۵، ۳۹۸، ۳/ ۱۹۵، فہرس الفہارس، ۲/ ۳۹۴، ۹۰۸، تحبیر الموشین، ص ۱۱، الاعلام للزرکلی، ۷/ ۱۴۶، ابجد العلوم الوشی المرقوم فی بیان احوال المعلوم، صدیق حسن خان القنوجی، دارالکتب العلمیۃ، بیروت، ۳/ ۱۰، معجم المطبوعات العربیۃ والمعرّبۃ، جمع و ترتیب، یوسف الیاس سرکیس، الریاض، ص ۱۴۷۰

۱۴ کشف الظنون، ۱/ ۱۴۸، ۲/ ۴۵۵؛ طبقات المفسرین، ۲/ ۲۷۶، العقد الثمین، ۳/ ۱۹۵، الضوء اللامع، ۱۰/ ۸۱، البلغۃ فی تراجم النحو واللغۃ، الفیروزآبادی، تحقیق محمد المصری، جمعیۃ احیاء التراث الاسلامی الکویت، ص ۳۲، بغیۃ الوعاۃ فی طبقات اللغویین والنحاۃ، السیوطی، ۱/ ۲۷۴، روضات الجنات، ۸/ ۱۰۲

۱۵ بصائر ذوی التمییز، ۲/ ۱۲، ۴۷، ۱۳۱، ۱۵۲، ۱۷۴، ۳/ ۲۰۹، ۲۱۰، ۴۵۰، ۴۷۷، ۴/ ۲۱۹، ۱۷۹، ۲۹۵، ۵/ ۲۸، ۲۳۹، ۲۳۰، ۲۳۹

۱۶ حوالہ سابق، ۵/ ۲۸

۱۷ حوالہ سابق، ۴/ ۲۹۵

۱۸ حوالہ سابق، ۴/ ۳۸۱، ۴۲۳، ۴۶۱، ۵/ ۶۰، ۶۲، ۶۳

۱۹ حوالہ سابق، ۲/ ۲۵۵

۲۰ حوالہ سابق، ۵/ ۳۲۵

۲۱ تنویرالمقیاس، ص ۱۶۸

۲۲ حوالہ سابق، ص ۳۰۶، ۲۶۸

۲۳ البصائر، ۳/ ۲۰۹، ۴/ ۲۲۴

۲۴ حوالہ سابق، ۴/ ۲۴۴

۲۵ حوالہ سابق، ۴/ ۳۲۳

۲۶ حوالہ سابق، ۲/ ۵۳، ۳۰، ۳/ ۵۰، ۲۹۰، ۴/ ۵۰۷، ۵/ ۶۶، ۱۶۳

۲۷ حوالہ سابق، ۲/ ۵۴۰، ۴۸۰، ۳/ ۲۸۹، ۴۸۷، ۵۱۲، ۴/ ۵۹۸، ۳۸

۲۸ حوالہ سابق، ۳/ ۵۱۲، ۶۵، ۴/ ۱۸۴، ۱۸۵، ۲/ ۵۰۶

۲۹ حوالہ سابق، ۳/ ۲۰۶

۳۰ حوالہ سابق، ۲/ ۴۶۸

۳۱ حوالہ سابق، ۲/ ۵۹۰، ۲۳۵، ۱۲۲، ۱۱

۳۲ حوالہ سابق، ۴/ ۱۰۸

۳۳ حوالہ سابق، ۴/ ۵۳۶

۳۴ حوالہ سابق، ۲/ ۳۱۷، ۵۴۴، ۵۵۷، ۳/ ۱۰

۳۵ حوالہ سابق، ۴/ ۴۷

۳۶ حوالہ سابق، ۱/ ۶۷

۳۷ حوالہ سابق، ۱/ ۱۰۰

۳۸ حوالہ سابق، ۱/ ۱۰۶، تفسیر المنار، ۸/ ۳۰۲۲، الاتقان، ۲/ ۱۴۳، الکشاف، ۱/ ۱۶

۳۹ البصائر، ۱/ ۱۱۷

۴۰ حوالہ سابق، ۱/ ۱۱۷-۱۱۲

۴۱ حوالہ سابق، ۳/ ۸۷، ۱/ ۱۶۸، ۲۶۰، ۳۲۲، ۴۶۲

☆☆☆

ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی کی

دو اہم مطبوعات

۱- مذہب کا اسلامی تصور — مولانا سلطان احمد اصلاحی

اس کتاب میں معاملاتِ دنیا سے مذہب کی بے دخلی کے تصور کو اس کے خاص تاریخی تناظر میں دیکھا گیا ہے۔ کتاب کے پہلے باب میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ چرچ کے ناقابلِ بیان مظالم کے نتیجے میں یورپ میں چرچ اور اسٹیٹ کی علیحدگی اور مسیحیت سے بے زاری کے ساتھ خود مذہب سے بے زاری پیدا ہوگئی تھی۔ دوسرے باب میں قرآن اور سنت کی روشنی میں اسلام کے مطلوبہ تصوّرِ مذہب کو پورے شرح وبسط کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

آفسیٹ کی عمدہ طباعت، صفحات: ۵۹۱ قیمت =/۱۰۰ روپئے

۲- قرآن، اہلِ کتاب اور مسلمان — ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

قرآنِ کریم میں اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ) کے حالات پر بہت تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان پر اللہ تعالیٰ کے انعامات واحسانات، ان کی بداعتقادیوں اور بداعمالیوں کی تفصیلات اور ان کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے دی جانے والی سزاؤں اور تنبیہوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اہلِ کتاب کے اس مفصل تذکرہ کا مقصد کیا ہے؟ اس میں مسلمانوں کے لیے عبرت ونصیحت کے کون سے پہلو ہیں؟ اور اس سے انہیں کیا رہنمائی ملتی ہے؟ اس کتاب میں ان موضوعات سے بحث کی گئی ہے۔

کتاب پر مولانا سید جلال الدین عمری کا مبسوط اور تحقیقی مقدّمہ بھی ہے۔

عمدہ کاغذ، آفسیٹ کی حسین طباعت، دیدہ زیب سرورق، صفحات: ۲۹۶ قیمت =/۷۰ روپئے

ملنے کے پتے

ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی، پوسٹ بکس نمبر: ۹۳، علی گڑھ-۱

مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی- ۲۵

تعارف وتبصرہ

عصر حاضر کا سماجی انتشار اور اسلام کی رہ نمائی مولانا سلطان احمد اصلاحی

ناشر: مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی، سنہ اشاعت: ۲۰۱۱ء، صفحات: ۳۱۶، قیمت: -/ ۱۲۵ روپے

موجودہ دور کا ایک سنگین المیہ یہ ہے کہ انسانی معاشرہ شدید انتشار اور بحران کا شکار ہے۔ اخلاقی قدریں پامال ہورہی ہیں اور باہمی تعلقات خودغرضی اور مفاد پرستی کی بھینٹ چڑھ گئے ہیں۔ حتیٰ کہ خاندان کا ادارہ بھی اس کی لپیٹ میں آگیا ہے۔ افرادِ خاندان، جن کے درمیان عام انسانوں کے مقابلے میں زیادہ قریبی تعلقات ہوتے ہیں اور انھیں ایک دوسرے کا ہم درد وغم گسار ہونا چاہیے، وہ نہ صرف یہ کہ دوسروں کے حقوق کی ادائی سے بے پروا ہیں، بلکہ ان پر ظلم ڈھانے اور ان کے حقوق غصب کرنے سے بھی نہیں ہچکچاتے۔ اس طرح انسانی معاشرہ حیوانی سماج کا منظر پیش کررہا ہے۔ یہ صورت حال عالمی سطح پر بھی ہے اور ہمارے ملک کا منظر نامہ بھی اس سے قطعی مختلف نہیں ہے۔ اس صورت حال میں اسلام مظلوم اور سسکتی بلکتی انسانیت کے حقیقی ہم درد کی حیثیت سے سامنے آتا ہے۔ وہ سماج کے تمام افراد کے حقوق بیان کرتا اور ان کی ادائی پر زور دیتا ہے، خاص طور سے وہ افرادِ خاندان کے درمیان الفت ومحبت کے جذبات پروان چڑھاتا ہے اور اسے مستحکم رکھنے کی تدابیر بتاتا ہے۔ اس کی تعلیمات اور بتائی ہوئی تدابیر پر عمل کرکے پہلے بھی ایک پاکیزہ اور مثالی معاشرہ وجود میں آچکا ہے اور موجودہ دور میں بھی ان کے ذریعے سماجی اور خاندانی انتشار واضطراب کو دور کیا جاسکتا ہے۔

اس کتاب میں انھی موضوعات پر شرح وبسط کے ساتھ اظہار خیال کیا گیا ہے۔ انسانی سماج کے مختلف پہلوؤں کی منظر کشی اعداد وشمار اور واقعات کی روشنی میں کی گئی ہے، ان میں بے اعتدالی، فساد اور انتشار کو نمایاں کیا گیا ہے اور ان کی اصلاح اور درستگی کے لیے اسلامی تعلیمات پیش کی گئی ہیں۔ اس سلسلے میں عام انسانی سماج کے ساتھ خاندان کو بھی خاص طور پر موضوعِ بحث بنایا گیا ہے اور موجودہ دور میں اس کی ابتری اور انتشار واضح کرنے کے ساتھ اسلام کے مطلوبہ نظامِ خاندان کے خدّ وخال نمایاں کیے

گئے ہیں۔

مولانا سلطان احمد اصلاحی کو سماجی موضوعات سے دل چسپی رہی ہے اور انھوں نے اپنی تصانیف میں وقت کے نازک سماجی مسائل کا قرآن وحدیث کی روشنی میں حل پیش کیا ہے۔ اس سے قبل مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی سے سماجی موضوعات پر ان کی کتابیں 'اسلام کا تصورِ مساوات'، 'بچوں کی مزدوری اور اسلام'، 'بندھوا مزدوری اور اسلام'، 'کم سنی کی شادی اور اسلام'، 'مشترکہ خاندانی نظام اور اسلام' شائع ہوچکی ہیں اور انھیں علمی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ موصوف نے پینتیس (۳۵) سال سے زائد عرصہ تک ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ سے وابستہ رہ کر تصنیفی خدمات انجام دی ہیں۔ یہ کتاب بھی ادارہ کے منصوبہ کے تحت لکھی گئی ہے۔ امید ہے کہ ادارہ کی دیگر کتابوں کی طرح اسے بھی مقبولیت حاصل ہوگی اور اس سے خاطر خواہ استفادہ کیا جائے گا۔ (محمد رضی الاسلام ندوی)

حضرت خضر تحقیق کی روشنی میں — ڈاکٹر غلام قادر لون

ناشر: القلم پبلی کیشنز، بارہ مولہ، کشمیر، ۲۰۱۱ء، ص ۱۶۸، قیمت: -/۱۰۰ روپے

قرآن کریم کی سورۂ کہف میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں مذکور ہے کہ ان کی ملاقات اللہ تعالیٰ کے ایک بندے سے ہوئی، جسے اس نے اپنی رحمت سے نوازا تھا اور اپنی طرف سے ایک خاص علم عطا کیا تھا (آیت ۶۵) روایات میں اس 'بندے' کا نام خضر آیا ہے۔ مفسرین، محدثین اور مؤرخین نے اپنی کتابوں میں حضرت خضر کے بارے میں بہ کثرت روایات نقل کی ہیں اور تفصیلی معلومات فراہم کرنے کی کوشش کی ہے، اہلِ تصوف کو ان کی شخصیت سے خاص دل چسپی رہی ہے اور ادبا وشعرا نے بھی خضر، حیات جاوداں اور آب حیات کے استعاروں سے اپنے کلام میں ندرت پیدا کی ہے۔ لیکن ان کے بارے میں بیان کیے جانے والے واقعات اتنے متضاد اور پُر اسرار ہیں کہ ان کی شخصیت اساطیری بن گئی ہے۔ محدثین نے ان سے متعلق بیش تر روایات کو ضعیف اور موضوع قرار

دیا ہے۔ زیرِ نظر کتاب میں دستیاب مراجع کی روشنی میں حضرت خضر کے بارے میں تفصیلی معلومات پیش کی گئی ہیں۔

کتاب کی ابتدا میں حضرت خضر کے نام ونسب سے بحث کی گئی ہے اور حالات زندگی بیان کیے گئے ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ انھیں حیاتِ جاوداں عطا کی گئی ہے، جب کہ بعض اس کا انکار کرتے ہیں۔ اسی طرح اس میں بھی اختلاف ملتا ہے کہ وہ نبی تھے یا ولی۔ مصنف نے ان موضوعات پر تفصیل سے بحث کی ہے اور دونوں نقطہ ہائے نظر کے حاملین کے دلائل نقل کیے ہیں۔ خاص طور پر امام ابن تیمیہ، علامہ ابن قیم، علامہ ابن الجوزی، حافظ زین الدین عراقی، ملاّ علی قاری اور دیگر محدثین کے اقوال درج کیے ہیں، جنھوں نے خضر کے بارے میں منقول روایات کا اسناد اور درایت دونوں پہلوؤں سے جائزہ لیا ہے اور انھیں من گھڑت قرار دیا ہے۔

مصنف کتاب ڈاکٹر غلام قادر لون علمی حلقوں میں معروف ہیں۔ ان کی کتابیں مطالعۂ تصوف قرآن وسنت کی روشنی میں اور قرون وسطیٰ میں مسلمانوں کے سائنسی کارنامے، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی سے شائع ہوکر قارئین سے خراج تحسین حاصل کرچکی ہیں۔ یہ کتاب بھی انھوں نے بڑی عرق ریزی سے مستند حوالوں کے ساتھ تیار کی ہے۔ امید ہے، اہل علم اور موضوع سے دلچسپی رکھنے والوں کے یہاں اسے پذیرائی حاصل ہوگی۔ (م-ر)

معاشی مسائل اور قرآنی تعلیمات مرتبین: اوصاف احمد، عبدالعظیم اصلاحی

ناشر: ادارۂ علوم القرآن، شبلی باغ، پوسٹ بکس نمبر ۹۹، علی گڑھ، ۲۰۱۱ء، ص: ۲۵۶، قیمت-/۱۶۰ روپے

ادارۂ علوم القرآن علی گڑھ گزشتہ کئی سالوں سے ہر سال عصری اہمیت کے حامل کسی موضوع پر سمینار منعقد کرتا ہے۔ ۲۰۱۰ء میں ۶-۷ نومبر کو ہونے والے سمینار کا موضوع تھا 'معاشی مسائل اور قرآنی تعلیمات'۔ شرکاء سمینار نے اس میں انگریزی، عربی اور اردو تینوں زبانوں میں مقالات پیش کیے تھے۔ اردو اور عربی مقالات کا مجموعہ پیش نظر

ہے۔انگریزی مقالات کا مجموعہ الگ سے Economic Problems and the Teachings of the Quran کے نام سے شائع کیا گیا ہے۔

یہ مجموعہ مقدمہ اور ڈاکٹر اوصاف احمد کے کلیدی خطبہ کے علاوہ آٹھ اردو مقالات اور ایک عربی مقالہ پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر عبدالعظیم اصلاحی نے اپنے مقالہ میں قرآن اور معاشیات کے موضوع پر اردو، عربی اور انگریزی کی آٹھ اہم تصانیف کا تعارف کرایا ہے، جو اس موضوع سے دل چسپی رکھنے والوں کے لیے کافی کارآمد ہے۔ مولانا نسیم ظہیر اصلاحی نے اپنے مقالہ میں اس پہلو کو ابھارا ہے کہ قرآنی معاشی نظام کس طرح دیگر نظام ہائے معیشت سے مختلف ہے اور اس کی کیا اہم خصوصیات ہیں؟ مولانا محمد عمر اسلم اصلاحی نے سورۃ البقرۃ کے حوالے سے قرآن کی چند اہم معاشی تعلیمات پر روشنی ڈالی ہے اور معاشرہ سے ان کے ربط کو واضح کیا ہے۔ ڈاکٹر محی الدین غازی نے قرآن کی روشنی میں فساد فی الارض کے مالی و معاشی اثرات کا جائزہ لیا ہے۔ پروفیسر شاہ محمد وسیم نے 'قرآنی معاشرہ، معیشت اور تجارت' کے عنوان کے تحت معاشرہ، انسان اور وحدت انسانی، عدل اور بقائے باہم، اسلام اور معیشت و تجارت پر قرآن و حدیث کی روشنی میں بحث کی ہے۔ پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی نے اپنے مقالہ میں ثابت کیا ہے کہ ربا (سود) شریعتِ الٰہی میں ہمیشہ سے حرام رہا ہے۔ ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی جامعی نے افزائش دولت کے جائز اور ناجائز طریقوں سے بحث کی ہے۔ یہ تمام مقالات محنت سے لکھے گئے ہیں اور ان سے قرآن اور معاشیات کے مختلف پہلوؤں پر قیمتی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ راقم سطور کا مقالہ 'اسلامی نظامِ وراثت میں عورت کا حصہ' کے عنوان سے ہے۔

اس مجموعہ کا واحد عربی مقالہ 'نظام المیراث فی القرآن' ڈاکٹر محمد عنایت اللہ سبحانی کے قلم سے ہے۔ اس مقالہ میں ان کے متعدد نتائج فکر جمہور فقہاء کی آراء سے ہٹے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ یتیم پوتا دادا کی میراث میں محروم نہیں ہوگا، بلکہ اپنے باپ کا قائم مقام ہوکر حصہ پائے گا۔ شاید اسی وجہ سے مرتب نے اپنے مقدمہ میں صراحت

کردی ہے کہ ''اس مجموعہ میں جو بھی آراء پیش کی گئی ہیں وہ مقالہ نگاروں کی اپنی تحقیقات ہیں، انھیں ادارہ علوم القرآن کی رائے نہیں سمجھنی چاہیے'' (ص۱۲)۔ (م-ر)

تاریخ تدوین وجمعِ قرآن تالیف: ڈاکٹر اسماعیل احمد الطحان

ناشر: اسلامک بک فاؤنڈیشن، ۱۷۸۱- حوض سوئی والان، نئی دہلی-۲، صفحات: ۵۶، قیمت -/۴۰ روپے

اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ آخری کتاب قرآن مجید اور صاحبِ کتاب حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے اعمال و ارشادات، جنھیں اسلامی اصطلاح میں حدیث کہا جاتا ہے، اسلام کے بنیادی مآخذ ہیں۔ یہ دونوں لازم وملزوم ہیں۔ ان کے بغیر اسلام کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ ان میں سے کسی ایک کا انکار یا استخفاف اسلام کا ردّ و استخفاف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دشمنانِ اسلام کی نگاہ میں یہ دونوں چیزیں ہمیشہ کھٹکتی رہی ہیں۔ آئے دن ان کی طرف سے ان دونوں بنیادوں پر حملے ہوتے رہتے ہیں۔ کبھی قرآن مجید کے سلسلے میں ناسخ ومنسوخ کی بحث چھیڑ کر، تو کبھی رسول اللہ ﷺ کی احادیث وسنت کے سلسلے میں شارع اور شارح کی نکتہ آفرینی پیدا کرکے لوگوں کی یک سوئی مجروح کی جاتی ہے۔ انیسویں صدی کے نصف آخر سے تشکیک وشبہات کے ان فتنوں نے کچھ زیادہ ہی پَر پُرزے نکالے ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کا فضل ہے کہ امت کے بیدار مغز اور اصلاح پسند اہل علم ہمیشہ اس طرف متوجہ رہے ہیں اور ان فتنوں کی سرکوبی کرتے رہے ہیں۔

ایک طبقہ یہ تاثر دینا چاہتا ہے کہ چوں کہ عہد رسولؐ میں قرآن مجید مرتب شکل میں نہیں تھا، حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے دور میں حافظے اور یادداشت کی بنیاد پر اس کی موجودہ شکل سامنے آئی ہے، اس لیے ممکن ہے کہ اس کا کچھ حصہ ضبط تحریر میں آنے سے رہ گیا ہو۔ اس سلسلے میں علمائے کرام نے بڑے ٹھوس اور مدلل جوابات دیے ہیں۔ اِس ذیل میں مولانا عبداللطیف رحمانی کی 'تاریخ القرآن'، جناب صدیق حسن صاحب کی 'جمع وتدوین قرآن' اور مولانا سید مناظر احسن گیلانی کی 'تدوین قرآن' کو خصوصی شہرت حاصل ہے۔ ڈاکٹر اسماعیل الطحان کی زیر نظر کتاب

'تاریخ تدوین وجمع قرآن' بھی اسی سلسلے کی ایک عمدہ کوشش ہے۔ یہ کتاب عربی میں تھی۔ ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی نے سہل اور عام فہم اردو زبان میں اس کے ترجمہ کی خدمت انجام دی ہے۔

کتاب میں مصنف نے مضبوط دلائل کے ساتھ ثابت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو پورا قرآن زبانی یاد تھا، آپ اسے دوہراتے رہتے تھے اور اپنے ہی سامنے اُسے مکمل طور پر لکھوا بھی لیا تھا۔ کتابت وحی کے لیے آپ نے بعض صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو متعین بھی کر رکھا تھا۔ ایسی صورت میں اس میں کسی بھی قسم کا شک وشبہ پیدا کرنا سراسر باطل ہے۔

بلاشبہ یہ کتاب بہ قامت کہتر بہ قیمت بہتر کی مصداق ہے۔ (تابش مہدی)

﴿معرکۂ اسلام و جاہلیت﴾

مولانا صدرالدین اصلاحی

اسلام کی بصیرت افروز آگہی کے لیے جاہلیت سے واقفیت ناگزیر ہے۔

☆عقائد، عبادات، اخلاقیات اور زندگی کے تمام معاملات میں جاہلیت اور اسلام کے درمیان اصولی فرق کیا ہے؟

☆دونوں کے درمیان فطری اور مسلسل کش مکش کا انداز کیا ہے؟

☆ جاہل عناصر کس طرح اسلامی تصورات میں اپنی جگہ بنا لیتے ہیں؟

ان اہم پہلوؤں پر اس کتاب میں سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ مصنف کے گہر بار قلم نے موضوع کا حق ادا کر دیا ہے۔ صفحات: ۲۱۶ قیمت: -/۸۵ روپئے

اس کتاب کا انگریزی ترجمہ ڈاکٹر اسرار احمد خان نے انتہائی معاری اور دلکش اسلوب میں Islamic Civilization in its Real Prespective کے نام سے کیا ہے۔

آفسیٹ کی عمدہ طباعت صفحات: ۱۳۷ قیمت: -/۹۰ روپئے

ملنے کے پتے: ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی، پوسٹ بکس نمبر-۹۳، علی گڑھ-۲

مرکزی مکتبہ اسلامی پبلیشرز، دعوت نگر ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی-۲۵

خبرنامہ ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی (۴۲)

☆ صدر ادارہ و امیر جماعت اسلامی ہند مولانا سید جلال الدین عمری کی کتاب 'خدا کی غلامی انسان کی معراج' کو دینی وتحریکی حلقوں میں مقبولیت حاصل ہے۔ مختصر عرصے میں اس کے کئی ایڈیشن منظر عام پر آئے ہیں۔ اس کا ترجمہ ہندی، تلگو اور مراٹھی میں شائع ہو چکا ہے۔ اب جناب عثمان محمد اقبال صاحب نے اس کا انگریزی ترجمہ Submission to God - Glory to man کے نام سے کر دیا ہے اور مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز سے اس کی اشاعت عمل میں آئی ہے۔ صفحات: ۴۸، قیمت: ۲۴ روپے

☆ دوسری میقات کے لیے جماعت اسلامی ہند کا امیر منتخب ہونے کے بعد مولانا عمری نے ایک طویل انٹرویو دیا تھا جس میں ان کی علمی دل چسپیوں اور جماعت کی سرگرمیوں کے علاوہ مختلف ملّی، ملکی اور عالمی امور و مسائل تفصیل سے زیر بحث آئے تھے۔ مرکزی مکتبہ اسلامی سے اس کی اشاعت کتابی صورت میں ہوگئی تھی۔ اب اس کا تمل ترجمہ اسلامک فاؤنڈیشن ٹرسٹ چنّئ سے معیاری اور دیدہ زیب طباعت کے ساتھ منظر عام پر آیا ہے۔ صفحات: ۸۸، قیمت: -/۴۰ روپے۔

☆ مولانا عمری کا ایک خطاب مرکزی مکتبہ اسلامی نے 'وقت حساب' کے عنوان سے شائع کیا تھا۔ اب اس کا تمل ترجمہ بھی اسلامک فاؤنڈیشن ٹرسٹ سے شائع ہوگیا ہے۔ صفحات: ۷۲، قیمت: -/۲۵ روپے۔

☆ ادارۂ تحقیق کے علمی منصوبہ کے تحت سابق رکن ادارہ مولانا سلطان احمد اصلاحی نے 'اسلام - ایک نجات دہندہ تحریک' کے عنوان سے ایک ضخیم کتاب تیار کی تھی۔ مرکزی مکتبہ اسلامی نے اسے تین حصوں میں تقسیم کر کے الگ الگ عنوانات سے شائع کر دیا ہے: اسلام ایک نجات دہندہ تحریک، صفحات: ۲۱۶، قیمت: ۹۰/روپے۔ عصر حاضر کا سماجی انتشار اور اسلام کی رہ نمائی، صفحات: ۳۱۶، قیمت: ۱۲۵/روپے۔ عصر حاضر کی نفسیاتی الجھنیں اور ان کا اسلامی حل، صفحات: ۲۱۶، قیمت: ۹۰/روپے۔

☆ معاون مدیر مجلّہ ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی کی کتاب 'انبیائے کرام کی دعوت - موضوعات اور خصوصیات'، جو ادارہ کے منصوبے کے تحت تیار کی گئی تھی، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز سے شائع ہوگئی ہے۔ صفحات: ۱۲۸، قیمت: ۶۰ روپے۔ اس کے علاوہ ماہ نامہ زندگی نو نئی

دہلی میں رسائل ومسائل کالم کے تحت وہ جن فقہی وعلمی سوالات کے جوابات دیتے رہے ہیں، ان کا دوسرا مجموعہ مکتبہ سے 'زندگی کے عام فقہی مسائل' (جلد دوم) کے عنوان سے شائع ہوگیا ہے۔ صفحات: ۲۴۰، قیمت: -/۱۰۰ روپے۔

☆ تحقیقات اسلامی میں شائع شدہ ڈاکٹر ندوی کے قلم سے ایک عربی مضمون کا ترجمہ 'تاریخ جمع وتدوین قرآن' اسلامک بک فاؤنڈیشن نئی دہلی نے کتابی صورت میں شائع کردیا تھا [صفحات: ۵۶، قیمت: -/۴۰ روپے] اب اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی سے بھی وہ شائع ہوگیا ہے۔

☆ ادارہ کے سلسلۂ توسیعی خطبات کے تحت مورخہ ۱۶/ اکتوبر ۲۰۱۱ء کو ڈاکٹر محمد ذکی کرمانی نے 'اسلامائزیشن آف نالج: سائنس کے تناظر میں' کے موضوع پر مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے اس اصطلاح کا تاریخی پس منظر بیان کرتے ہوئے ان تحریکات اور شخصیات کی خدمات پر بھی روشنی ڈالی جنھوں نے گزشتہ صدی میں مختلف علوم کو اسلامیانے کی کوشش کی ہے۔ اس پروگرام کی صدارت ڈاکٹر محمد ریاض کرمانی نے کی۔ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے اساتذہ، طلبہ اور دیگر حضرات نے شرکت کی۔

☆ مورخہ یکم دسمبر ۲۰۱۱ء کو ادارہ کے زیر تربیت اسکالرس کی انجمن 'رائٹرس فورم' کی ماہانہ نشست ہوئی۔ اس میں مولانا ظفر صادق ندوی نے 'شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا نظریۂ ارتفاقات اور اس کی معنویت' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔

☆ ادارہ میں زیر تربیت اسکالر مولانا مزمل کریم فلاحی قاسمی نے اپنا دوسالہ تربیتی کورس مکمل کرلیا ہے اور اس عرصہ میں ایک مبسوط مقالہ بہ عنوان 'قرآنی قصے: دروس ونصائح' لکھ کر ادارہ کے حوالے کردیا ہے۔ ادارہ کی مجلس منتظمہ نے فیصلہ کیا ہے کہ ان کی علمی دل چسپی اور یکسوئی کے مدنظر انھیں ادارہ میں رہ کر مطالعہ وتحقیق جاری رکھنے کا مزید موقع دیا جائے۔

☆ ادارۂ تحقیق اور مجلّہ تحقیقات اسلامی کے وابستگان اور بہی خواہان کے لیے یہ خبر بڑی باعث رنج والم ہوگی کہ جناب نیاز احمد شریف (بنگلور) کا مورخہ ۱۸/ نومبر ۲۰۱۱ء کو انتقال ہوگیا۔ موصوف نے ذاتی دل چسپی اور شوق سے تحقیقات اسلامی کی ویب سائٹ تیار کی تھی اور اس کے آغاز اجراء سے اب تک کے تمام شماروں کو اسکین کرکے انھیں اس پر اپ لوڈ کردیا تھا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں جنت الفردوس میں جگہ دے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

دو نئی مطبوعات

از

ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

۱- انبیائے کرام کی دعوت- موضوعات اور خصوصیات

قرآن کریم میں کتنے انبیاء کا تذکرہ ہے اور ان میں سے کن کن انبیاء کی دعوت کا تفصیلی بیان موجود ہے؟ اپنی قوموں کے سامنے ان انبیاء کی دعوت کے بنیادی نکات اور موضوعات کیا تھے؟ انھوں نے کن کاموں کا حکم دیا اور کن کاموں سے روکا؟ دعوت انبیاء کی اہم خصوصیات کیا ہیں؟ اس کتاب میں ان موضوعات پر قرآن کریم کی روشنی میں بحث کی گئی ہے۔ صفحات: ۱۲۸، قیمت: ۶۰ روپے

۲- اہلِ مذاہب کو قرآن کی دعوت

زمانۂ نزول قرآن میں یہودیت اور عیسائیت دو بڑے مذاہب تھے۔ قرآن نے ان کے ماننے والوں کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کی اور ان کی تحریفات اور انحرافات کی نشان دہی کرتے ہوئے واضح کیا کہ اسلام ہی اللہ کا اصل دین ہے، جسے لے کر ہر پیغمبر آیا تھا اور جس کے ساتھ اب آخری پیغمبر حضرت محمد ﷺ بھیجے گئے ہیں۔

اس کتاب میں ان بنیادی نکات کو نمایاں کیا گیا ہے جنھیں راہِ دعوت میں کام کرنے والوں کو دیگر اہل مذاہب سے گفتگو کرتے ہوئے اور ان کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کرتے ہوئے ملحوظ رکھنا چاہیے۔ اس مطالعہ میں قرآن کریم کو بنیاد بنایا گیا ہے اور قدیم وجدید کتب تفسیر سے بھی فائدہ اٹھایا گیا ہے۔

صفحات: ۸۴، قیمت: -/۴۵ روپے

ملنے کے پتے

ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی، پوسٹ بکس نمبر: ۹۳، علی گڑھ-۱

مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی- ۲۵

R.No. 38933/81 Quartely Mob. 09897655171
Tahqeeqat-e-Islami Phone: 0571-2902034
JANUARY.....2012 Aligarh MARCH.....2012

مولانا سید جلال الدین عمری کی مطبوعات

شمار	نام کتاب	قیمت	شمار	نام کتاب	قیمت
۱	غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق	۱۴۰/	۲۰	دولت میں خدا کا حق	۱۰/
۲	اسلام - انسانی حقوق کا پاسبان	۵۵/	۲۱	انفاق فی سبیل اللہ	۲۰/
۳	غیر اسلامی ریاست اور مسلمان	۲۵/	۲۲	انسان اور اس کے مسائل	۴۰/
۴	کم زور اور مظلوم اسلام کے سایہ میں	۵۰/-۳۵/	۲۳	اسلام اور مشکلات حیات	۲۰/۲۵
۵	صحت و مرض اور اسلامی تعلیمات	۲۰۰/	۲۴	خدا کی غلامی - انسان کی معراج	۱۰/
۶	خدا اور رسول کا تصور - اسلامی تعلیمات میں	۸۰/	۲۵	اسلام اور وحدت بنی آدم	۶/
۷	معروف و منکر	۸۵/	۲۶	اسلام میں خدمت خلق کا تصور	۱۱۰/
۸	اسلام کی دعوت	۱۴۰/	۲۷	انسانوں کی خدمت - اسلام کی نظر میں	۱۰/
۹	اسلام - ایک دین کی دعوت	۸/	۲۸	جماعت اسلامی ہند - پس منظر، مقاصد اور طریق کار	۱۵/
۱۰	ہندوستان میں اسلام کی دعوت - اہمیت اور تقاضے	۵/	۲۹	ہم تحریک اسلامی کے کارکن کیسے بنیں؟	۶/
۱۱	دعوت و تربیت - اسلام کا نقطۂ نظر	۵۰/	۳۰	ملک و ملت کے نازک مسائل اور ہماری ذمہ داریاں	۳۰/
۱۲	قرآن مجید کا تصور تزکیہ	۴۰/	۳۱	یہ ملک کدھر جا رہا ہے؟	۲۰/
۱۳	عورت - اسلامی معاشرے میں	۱۶۰/	۳۲	وقت حساب	۱۰/
۱۱۴	مسلمان عورت کے حقوق اور ان پر اعتراضات کا جائزہ	۸۰/	۳۳	آخرت کے عذاب سے خاندان کو بچائیے	۱۰/
۱۵	عورت اور اسلام	۱۰/-۲۵/	۳۴	اسلام کا شورائی نظام	
۱۶	مسلمان خواتین کی ذمہ داریاں	۱۵/	۳۵	فقہی اختلافات کی حقیقت	۱۰/
۱۷	اسلام کا عائلی نظام	۸۵/	۳۶	بعض اہم اسلامی اصطلاحات کی تشریح	۱۲/
۱۸	بچے اور اسلام	۵/	۳۷	سوئے حرم چلا	۱۵/
۱۹	تحقیقات اسلامی کے فقہی مباحث	۱۰۰/	۳۸	دینی علوم کی تدریس	۱۲/

ملنے کے پتے:

۱- ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی، نئی عمر، پوسٹ بکس نمبر: ۹۳، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲

۲- مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، ڈی-۳۰۷، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی ۲۵